طلوعِ اسلام

جولائی ۱۹۵۳

-/10/-

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ———

۱. تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴. حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بہترین مظہر تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں سیرت کے متعلق ایسی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جن سے حضور کی سیرت و اقدار پر حرف آتا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس کا آخری مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی شکل کی صورت یہ ہوگی کہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں گے۔ انہی قوانین کو شریعت کہا جاتا ہے۔ یہ جزئی قوانین حالات کے ساتھ بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوتی چلی جائے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ کہتے ہیں یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذمہ لینا۔

۸. ربوبیت عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرہ کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم [illegible] اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ابتداءً پاکستان میں اور اسکے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے تاکہ مقصدِ خداوندی کی رو سے ہر انسان کی ذاتی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کیجئے اور طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

معراج انسانیت

اور

نوادرات

کی قیمتوں میں رعایت صرف ۳۱ جولائی ۵۳ء تک

معراج انسانیت بیس روپئے کی بجائے صرف
پندرہ روپئے میں اور نوادرات چار روپئے
کی بجائے صرف تین روپئے میں مہیا کی جائینگی۔

اگر آپ نے اب تک اپنا آرڈر نہیں دیا ہے تو جلدی کیجئے کیونکہ یہی ایک مہینہ باقی رہ گیا ہے جس میں آپ اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ۳۱ جولائی کے بعد ہر دو کتابیں پوری قیمت پر مل سکیں گی۔ محصول ڈاک و پیکنگ ہر حال میں بذمہ خریدار ہوگا جو علی الترتیب ایک روپیہ سات آنے اور دس آنے ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

طلوع اسلام کے مستقبل کے متعلق
صفحہ ۵۹-۶۱ کی تفاصیل بغور مطالعہ فرمائیے

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۶	جولائی ۱۹۵۳ء	نمبر ۷

فہرستِ مضامین

قرآن نے کیا کہا؟	۴	حقائق و عبر	۶۲-۶۵
لمعات	۵-۱۰	۱- مُلّا کا اسلام	
مسلمانوں میں طوکیت کی ابتداء	۱۱-۲۶	۲- کس کی مانیں	
پس چہ باید کرد	۲۷-۴۶	۳- اقبال اور شیکسپیر	
(محترم ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب)		۴- ملاقات عام	
ملت میں پارٹیوں کی ضرورت نہیں	۴۷-۵۳	۵- ذوق حسن و زیبائی سے محرومی	
میں تائید کرتا ہوں (محترم عرشی صاحب)	۵۵-۵۸	اعجاز القرآن	۶۷-۷۴
حلقۂ معاونین طلوع اسلام	۵۹-۶۱	(علامہ تمنا عمادی)	

قرآن نے کیا کہا؟

جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ دنیا میں ایک ایسا قاعدہ چلا آرہا ہے جسے ہر شخص بطور بنیادی حقیقت تسلیم کئے ہوئے ہے۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ جس قدر زمین کوئی شخص خرید لے یا گھیر لے وہ اس کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ جسقدر سامانِ معیشت وہ جمع کر لے وہ اس کے باپ دادا کا مال ہو جاتا ہے۔ اب اس کے حقِ ملکیت میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس سے ایک انچ زمین چھین سکے یا سامانِ معیشت کے ذخائر میں سے ایک رائی کے دانے کے برابر لے سکے۔ حتیٰ کہ مُلّا نے بھی اس پر فتویٰ دیدیا کہ سرمایہ دار کو یہ کچھ خدا نے دیا ہے اس لئے خدا کے دیئے ہوئے کو کوئی انسان چھین نہیں سکتا۔

قرآن نے کہا کہ ہاں! یہ لوگ اپنے حقِ ملکیت کے لئے یہی دلیل لاتے ہیں کہ یہ قانون قرناً قرن سے متواتر چلا آرہا ہے اس لئے اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ بل متعنا ھٰؤلاء و اباء ھم حتیٰ طال علیھم العمر (۲۱/۴۴)۔ لیکن انسانی معاشرہ کی یہ شکل صحیح نہیں۔ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے وسائل و اسباب معیشت، تمام انسانوں کی ضرورت کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ (سواء للسائلین)۔ اگر یہ لوگ از خود اس نظام کو قائم نہیں کرتے تو نہ کریں۔ ہم ان کے محتاج نہیں ہیں۔ ہمارا کائناتی قانون از خود، ایک غیر مرئی قوت سے، زمین کی جاگیرداریوں اور سامانِ معیشت کی سرمایہ داریوں کو ان بڑے بڑے زمینداروں اور اکابرین کی ملکیت سے چھین چھین کر کم کرتا جارہا ہے۔ افلا یرون انا نأتی الارض ننقصہا من اطرافہا (کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح معاشی ذرائع کی ملکیت کو ان بڑے بڑے لوگوں سے کم کرتے جارہے ہیں؟ ۲۱/۴۴)۔ اس کے باوجود کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے قانون پر غالب رہیں گے اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کو متشکل نہیں ہونے دیں گے۔ (افھم الغالبون۔ ۲۱/۴۴)؟ ایسا نہیں ہوگا۔ واللہ غالب علیٰ امرہ۔ خدا کا قانون غالب آکر رہے گا اور خدا کی طرف سے دیئے ہوئے رزق کے سرچشمے اس کے بندوں کے لئے عام ہو کر رہیں گے۔ [1]

---

[1] تفصیل ان امور کی "قرآنی نظام ربوبیت" میں ملے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

لندن سے آمدہ اطلاع کے مطابق محترم محمد علی صاحب وزیر اعظم مملکت پاکستان نے ٹیلی ویژن کی ایک ملاقات کے دوران میں فرمایا کہ

> میری گورنمنٹ ایسے آئین کے حق میں ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ پاکستان میں تھیاکریسی کی حکومت قائم ہو۔

ان سے سوال کیا گیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوگا۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ

> اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ رواداری برتی جائے۔ (ٹائمز آف کراچی مورخہ ۱۶ ؍ جون ۱۹۵۳ء)

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ محترم محمد علی صاحب نے ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں بیان کردیں اور غالباً دونوں لاشعوری طور پر۔ انھوں نے پہلے یہ کہا کہ مذہب ایک انفرادی مسئلہ ہے جس کا امور مملکت سے کوئی تعلق نہیں اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ مسلمانوں کی مملکت میں غیر مسلموں کے متعلق **اسلام** کی تعلیم یہ ہے کہ ان سے رواداری برتی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر مذہب اسلام ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا مملکت کے اجتماعی امور سے کچھ تعلق نہیں تو پھر وہ مملکت کے ایسے اجتماعی مسئلہ (یعنی غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق) کے متعلق کوئی حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ اور اگر اسلام ایک ایسے خالص سیاسی اور مملکتی مسئلہ کے متعلق بھی کچھ حکم دیتا ہے تو پھر وہ ایک فرد کا ذاتی مسئلہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ان حضرات کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ دین کے متعلق ان کی ذاتی معلومات بالکل نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں اتنی جرأت بھی ہوتی نہیں کہ ان سے جب دین کے متعلق کوئی سوال کیا جائے تو یہ کہہ سکیں کہ اس کے متعلق مجھے معلوم نہیں۔ اس کی بجائے یہ حضرات مذہب کے متعلق جو کچھ (شعوری یا لاشعوری طور پر) ان کے ذہن میں ہوتا ہے اسی کو دہرا دیتے ہیں۔

لیکن وزیر اعظم پاکستان کیلئے اس سوال کا تعلق مذہب سے تھا ہی نہیں۔ مملکت پاکستان کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی قرارداد مقاصد کو منظور کر چکی ہوئی ہے اور قرارداد مقاصد میں یہ لکھا ہے کہ پاکستان کا آئین "کتاب و سنت" پر مبنی ہوگا۔ لہٰذا جب تک یہ قرارداد منسوخ نہیں ہوتی اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پاکستان کے آئین میں مذہبی مداخلت ہو سکے گی یا نہیں۔ مذہب کی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو مجلس آئین ساز نے یہ فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ وہ ایک انفرادی مسئلہ نہیں ہے اور مملکت پاکستان کی سیاست مذہب سے الگ نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی واضح رہے کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی ایک مقتدر اعلیٰ ادارہ (SOVEREIGN BODY) ہے اور اس کے کسی فیصلے میں ترمیم و تنسیخ کا حق صرف اسی اسمبلی کو حاصل ہے۔ یہ ہے اس وقت تک آئینی پوزیشن اس سوال کی کہ پاکستان کا آئین کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

لیکن ہم نے جس مقصد کیلئے یہ تذکرہ چھیڑا ہے وہ ان دونوں عنوانات سے الگ ہے جیسا کہ طلوع اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ مجلس آئین ساز نے قرارداد مقاصد پاس کر کے اپنے لئے اور اس کے آگے بڑھ کر قوم اور ملک کیلئے ایک مستقل فتنہ کا باب کھول دیا ہے۔ قرارداد مقاصد سے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں قانون کتاب و سنت یا شریعت اسلامی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا کہ اس کا فیصلہ ادارہ شریعت [illegible] جو مروّجہ دستور پاکستان میں شامل ہو چکا ہے۔

یعنی مولوی صاحبان کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے لئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی کہ مجلس مقننہ کے ساتھ علماء کا ایک بورڈ بھی ہونا چاہئے جو یہ فتویٰ دیا کرے کہ زیر نظر مسئلہ میں شریعت کا کیا ارشاد ہے؟ گویا عملاً قانون سازی اور قانون کی تعبیر کے پورے اختیارات مولوی صاحبان کے ہاتھوں میں دیدیئے جائیں۔ دراصل یہ صورت پیدا کر دی تھی اس جماعت کے نازیانہ پروپیگنڈا نے جس کے ارباب حل وعقد نے اپنے سیاسی مقاصد کو مذہب کے نقاب میں چھپا رکھا ہے اور جن کا مطمح نگاہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے حکومت کی کرسیوں پر چھاپہ مار لیا جائے۔ یہ دراصل ایک سیاسی کھیل تھا جو آئین سازی کی بساط پر حکومت اور جماعت اسلامی کے درمیان کھیلا جا رہا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں حکومت کو بری طرح سے شکست ہوئی۔ ہر چند اس شکست کی خشت اول مرحوم لیاقت علی خاں کے وقت میں رکھی گئی تھی لیکن اسکی عمارت خواجہ ناظم الدین کے زمانہ میں تکمیل تک پہنچی۔ ہم اس تمام دوران میں ملک کے سنجیدہ طبقے کو اس آنیوالے خطرہ سے آگاہ کر رہے تھے۔ آپ طلوع اسلام کے فائلوں کو اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو نظر آئیگا کہ ان میں بار بار اس خطرہ کے دونوں گوشوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ ہم اس حقیقت کا بھی بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ اگر حکومت کے کاروبار میں مُلّا نے موثر اقتدار حاصل کر لیا تو تھوڑے سے عرصہ میں پاکستان کی حالت افغانستان سے بھی بدتر ہو جائیگی۔ دوسری طرف ہم یہ بھی بار بار کہہ چکے ہیں کہ جس قسم کا مذہب ملا پیش کر رہا ہے اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ملک کا نوجوان طبقہ سرے سے مذہب ہی سے متنفر ہو جائیگا اور وہ یہ کہہ اٹھے گا کہ مذہب ایک نجی مسئلہ ہے اسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ اس خطرہ کیلئے ہمارے سامنے ترکی کی مثال موجود ہے۔ وہاں کے ارباب اقتدار کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ مذہب کو مملکت سے الگ کر دیا جائے لیکن جس قسم کا مذہب علماء کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا وہ قطعاً اس قابل نہیں تھا کہ مملکت کے کاروبار کو ایک دن کیلئے بھی چلنے دے۔ وہاں کے ارباب بست وکشاد نے تنگ آکر یہ فیصلہ کر دیا کہ ایسے مذہب کو حجروں اور خانقاہوں تک محدود رہنا چاہئے۔ مملکت کا کاروبار مملکتی طریقوں پر سرانجام پائیگا۔ یہی بعینہٖ وہ حالات ہیں جن سے مجبور ہو کر وزیر اعظم پاکستان محترم محمد علی صاحب کو بھی وہی کچھ کہنا پڑا جو کچھ مصطفیٰ کمال نے کہا تھا۔ پاکستان کے ملاؤں میں جماعت اسلامی ماڈرن ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جس قسم کا مذہب ان ماڈرن ملاؤں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اسے مملکت کا آئین اور قانون بنانے کے بعد آپ ایک دن کیلئے بھی انسانوں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں؟ جس مذہب کی تعلیم یہ ہو کہ عقیدہ کی تبدیلی کی سزا موت ہے۔ جو مذہب یہ تعلیم دے کہ جس دشمن پر فتح حاصل کر لی جائے ان کی عورتوں کو سپاہیوں میں بانٹ دیا جائے اور انھیں بلا نکاح اور بلا تعداد امراء کی حرم سراؤں کی زینت بنا دیا جائے اور پھر جب جی چاہے انھیں بھیڑوں کی طرح منڈی میں فروخت کر دیا جائے[۱]، وہ مملکت جو ایسے مذہب کو سرکاری مذہب (State Religion) قرار دے وہ اس قابل رہ سکتی ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اپنا منہ دکھا سکے؟ جس مذہب کی تعلیم یہ ہو کہ ایک ایک شخص لاکھوں ایکڑ زمین کا واحد مالک ہو سکتا ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس سے ایک انچ زمین بھی چھین سکے[۲] وہ مذہب اس قابل ہے کہ اس دور میں دو قدم تک بھی کاروان انسانیت کا ساتھ دے سکے؟[۳] جو مذہب یہ حکم دے کہ آج بیسویں صدی میں وہ فقہ جاری کی جائے جو عباسیوں کے درباروں میں مرتب ہوئی تھی، کیا کوئی مملکت ایسے مذہب پر اپنے قانون کی بنیاد رکھکر ایک دن بھی زندہ رہ سکتی ہے؟[۴] یہ ہے وہ مذہب جو آپ کی وہ جماعت پیش کر رہی ہے جسے ماڈرن ہونے کا دعویٰ ہے اور جس کا زعم یہ ہے کہ حکومت و مملکت خود خدا نے ان کے نام پر لکھ رکھی ہے کیونکہ وہ صالحین کی جماعت ہے اور خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ حکومت صالحین کو ملا کرتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اگر اس مذہب کو سامنے رکھکر محترم محمد علی صاحب یہ نہ کہیں کہ حکومت پاکستان ایک ایسے آئین کے حق میں ہے جسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوگا تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ وہ ایسا کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں اور ہر سمجھ دار آدمی کو یہی کہنا چاہئے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو "مُلّا کے مذہب کے عجیب وغریب حقائق" شائع کردہ طلوع اسلام۔ [۲] دیکھئے "زمین کا مسئلہ" از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔
[۳] دیکھئے "قرآنی دستور پاکستان" شائع کردہ طلوع اسلام۔

لیکن ہم محترم وزیر اعظم سے اتنا کہنے کی جرأت کرینگے کہ اسلام وہ نہیں جو انھوں نے سمجھ رکھا ہے اور جو ان ملاؤں کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اسلام ایک دین (نظام زندگی) ہے جس کا مدار صرف دو چیزوں پر ہے (۱) وہ مستقل اقدار یا ابدی اصول جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اور (۲) انسان کی عقل، جسے پوری آزادی دی گئی ہے کہ وہ ان مستقل اقدار کے حدود کے اندر اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین و ضوابط خود وضع کرے۔ قرآن، کوئی چیستاں یا باطنی علم نہیں جو کسی مخصوص طبقہ ہی کی وراثت ہو۔ جو شخص بھی قاعدہ کے مطابق تھوڑی سی محنت کرے وہ اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ قرآن کی رو سے دین انفرادی مسئلہ نہیں بلکہ ان حدود کا نام ہے جن کے اندر زندگی کے مختلف شعبوں کی جزئیات مرتب ہوتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ حضرات ملاؤں کے ڈرائے ہوئے اور اس کے پیش کردہ مذہب کے ستائے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ خدا کی اس کتاب کو بھی خیرباد کہدیں جس پر ایمان لانے سے ہم اور آپ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ آپ نے ملا کے پیش کردہ مذہب کو دیکھ لیا، لیکن قرآن کا پیش کردہ دین غالباً ابھی تک آپ کے سامنے نہیں آیا۔ ورنہ آپ اسلام کے متعلق یہ کچھ کبھی نہ کہتے۔ اگر آپ کو اس کی اہمیت کا احساس ہو یا آپ سمجھنا چاہتے ہوں کہ قرآن کونسا دین پیش کرتا ہے تو اس کیلئے ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ وہ عنوانات متعین کریں جن کے مطابق آپ کے خیال میں پاکستان کا آئین مرتب ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ ان عنوانات کے متعلق قرآن کی تعلیم کیا ہے[1]؟ آپ قرآن کی اس تعلیم کو دیکھئے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ کیا وہ عقل و بصیرت کے خلاف جاتی ہے یا اس کی مزید رہنمائی کرتی ہے؟ آپ نہ تو کسی ملا سے پوچھئے اور نہ ان لوگوں کی باتوں میں آئیے جنھیں قرآن سے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ آپ ایک مرتبہ اس طریق کو آزما کر تو دیکھئے جسے ہم نے اوپر تجویز کیا ہے۔

ہم نے محض اسلئے لکھا ہے کہ آپ کسی وقت یہ نہ کہہ سکیں کہ خدا کے حقیقی دین کی طرف میری توجہ کسی نے بھی منعطف نہیں کرائی تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ آواز وزیر اعظم کے کانوں تک پہنچ سکے گی یا نہیں۔ لیکن جو حضرات ایسے ذرائع رکھتے ہیں۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری اس آواز کو ان کے کانوں تک پہنچا دیں اسلئے کہ ہمیں خطرہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ محترم وزیر اعظم صاحب اپنی لاعلمی یا غلط فہمی کی بنا پر ملا کے فرسودہ مذہب کو چھوڑتے چھوڑتے قرآن کا رشتہ بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں اور اس طرح مملکت پاکستان کو اس سرچشمۂ حیات کی خوشگواریوں اور شادابیوں سے محروم کر کے مملکت کو اسی جہنم میں لے جائیں جس میں آج دنیا کی دوسری قومیں مبتلا ہیں جنھیں مستقل اقدار حیات کی رہنمائی نہیں مل سکی اور جن کی حالت یہ ہے کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار　　عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکے

خدا کرے کہ ہماری یہ گذارشات درخور اعتنا سمجھی جائیں۔

(۲)

مارشل لاء کے سیاسی قیدیوں کے متعلق جو کچھ ہم نے گذشتہ ماہ کی اشاعت میں لکھا تھا ہمیں خوشی ہوئی کہ ملک کے سنجیدہ طبقہ نے اسے غور و فکر کا مستحق سمجھا۔ چنانچہ ملک کے مختلف گوشوں سے ہمارے پاس خطوط پہنچے جن میں اس کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس قسم کے پیچیدہ حالات میں اور اس قسم کے نازک مسئلہ کے متعلق جو راہ نمائی طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی گئی ہے فی الحقیقت وہی صحیح راہ نمائی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ طلوع اسلام کی اگر کوئی خوبی ہے تو صرف اسقدر کہ وہ ذاتی امیال و عواطف اور خارجی شور و غل سے متاثر ہوئے بغیر اپنی بصیرت کیلئے قرآن کے نور مبین سے راہ نمائی طلب کرتا ہے اور چونکہ قرآن اپنی راہ نمائی دینے میں کبھی بخل نہیں برتتا، بشرطیکہ راہ نمائی خالصتہً اسی کے قانون سے طلب کی جائے، اس لئے قرآن کی بارگاہ میں اس کی پھیلائی ہوئی جھولی کبھی خالی نہیں آتی کہ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا اس کا ارشاد ہے، ہم نے یہ لکھا تھا کہ کسی ایسے

[1] اس کے متعلق ملاحظہ فرمایئے "مسودہ قرآنی دستور پاکستان" جسے طلوع اسلام کی طرف سے مجلس آئین ساز کے پاس بھیجا گیا تھا اور جو "قرآنی دستور پاکستان" میں شائع ہو چکا ہے۔

شخص کے متعلق جسے کسی عدالت نے مجرم قرار دیکر سزا دیدی ہو یہ مطالبہ کہ اسے غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے یورپ کی سیاسی پارٹیوں کا ایجاد کردہ حربہ ہے۔ جس سے وہ حکومت پر دباؤ ڈالتی ہیں اور اس دباؤ سے یا تو اپنا مطلب نکال لیتی ہیں اور یا حکومت کو بدنام کرتی رہتی ہیں (کہ یہ بھی درحقیقت ان کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہوتا ہے) ـــــ اب جماعت اسلامی کی طرف سے ایک اور سوال اٹھایا گیا ہے اور وہ ہے "رحم کی درخواست" کے متعلق۔ ہمارے نزدیک یہ سوال بھی ایسا ہے جسکی اصل پوزیشن کا واضح کر دینا ضروری ہے۔ امیر جماعت اسلامی (پاکستان) محترم سلطان احمد صاحب، کراچی کی ایک پریس کانفرنس کے دوران میں فرمایا کہ

کراچی کے ایک معزز شہری نے ۲۲ مئی کو مرکزی حکومت کے پاس ایک اپیل پیش کر دی تھی جس میں مولانا (مودودی) کی رہائی کی درخواست کی گئی ہے۔ دفعہ ۴۰۱ کے اس اعلان کے بعد کہ جب تک مولانا مودودی خود رحم کی درخواست نہیں کرینگے ان کی رہائی کے مسئلہ پر غور نہیں کیا جائیگا، لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ کہیں . . . . . مولانا مودودی سے سیاسی انتقام تو نہیں لیا جا رہا۔ (حالانکہ) قانون میں یہ گنجائش موجود ہے کہ پاکستان کا کوئی شہری بھی سزا کی منسوخی کی درخواست دے سکتا ہے۔ اس قانونی خلا کو پورا کرنے کیلئے دو معزز شہری لاہور اور کراچی سے درخواستیں دے چکے ہیں۔

اس کے بعد ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ

مولانا مودودی خود رحم کی اپیل پر اسلئے دستخط کرنے کیلئے تیار نہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ برسر اقتدار لوگ ان سے سیاسی انتقام لے رہے ہیں۔

اس کے بعد محترم سلطان احمد صاحب نے بتایا کہ ان سے مودودی صاحب نے لاہور جیل میں کہا تھا کہ

میں تختۂ دار پر جانے کو تیار ہوں مگر ان لوگوں سے رحم کی درخواست نہیں کرونگا جو میرا جرم جانتے ہیں۔ یہ جرم آئینی مخالفت ہے۔ (بحوالہ جنگ کراچی۔ مورخہ ۲۰ مئی ۵۳ء)

اس بیان سے حسب ذیل نقاط سامنے آجاتے ہیں:-

(۱) جماعت اسلامی کے نزدیک حکومت سے رحم کی درخواست کرنا کچھ معیوب نہیں۔ موجودہ قانون میں اس کی گنجائش موجود ہے اور اس قانونی گنجائش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو معزز شہریوں کی طرف سے ایسی درخواستیں دی بھی جا چکی ہیں۔

اور

(۲) خود مودودی صاحب کے نزدیک بھی رحم کی درخواست کرنا شریعت کے خلاف نہیں لیکن وہ موجودہ برسر اقتدار لوگوں سے رحم کی درخواست نہیں کرنا چاہتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ان سے سیاسی انتقام لے رہے ہیں۔

یعنی جماعت اسلامی اور ان کے امیر (مودودی صاحب) دونوں کے نزدیک رحم کی درخواست کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں۔ البتہ مودودی صاحب "موجودہ برسر اقتدار طبقہ" سے رحم کی درخواست خود نہیں کرنا چاہتے (دوسرے لوگ ان کی طرف سے رحم کی درخواست کریں تو انہیں روکنا بھی نہیں چاہتے) اور محترم سلطان احمد صاحب اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے کہ موجودہ برسر اقتدار طبقہ سے رحم کی درخواست کی جائے (اسی لئے انھوں نے کہا ہے کہ اس قسم کی درخواستیں گذاری جا چکی ہیں) یہ ہے ان حضرات کا مسلک "رحم کی درخواست" کے متعلق۔ یعنی "رحم کی درخواست" کرنا از روئے شریعت منع نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی مجرم کسی خاص حاکم (یا حکومت کے طبقہ) سے کسی وجہ سے رحم کی درخواست کرنا ہی نہ چاہے۔

لیکن اب یہ دیکھئے کہ یہی مودودی صاحب "رحم کی درخواست" کے متعلق پہلے کیا فتویٰ صادر فرما چکے ہیں، وہ اپنی "دستوری تجاویز" میں فرماتے ہیں:-

رئیس مملکت کو رحم کے اختیارات نہیں ملنے چاہئیں۔ ایک اسلامی حکومت میں خلیفہ یا امیر کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ مجرموں کو عدالت کی دی ہوئی سزا سے محض رحم کی بنا پر معاف کر دے۔ یہ اختیارات تو بادشاہوں نے شانِ خدائی دکھانے کیلئے اپنے ہاتھوں میں رکھے تھے کہ انا احی وامیت کا دعویٰ کر سکیں۔ ایک اسلامی نظام میں ایسے اختیارات کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ البتہ رئیس مملکت اس امر کا مجاز ضرور ہے کہ وہ سیاسی جرائم

یا انتظامی سزاؤں کو مصالح عامہ کی خاطر معاف کر دے یا اگر کسی کو سزائے موت دینے میں بے انصافی کی گئی ہو تو اس سزا کو کسی دوسری سزا کو بربنائے عدل' نہ کہ بربنائے رحم' تبدیل کر دے۔ ان مقاصد کے لئے رئیس مملکت کو مشورہ دینے کی خاطر کوئی مجلس عدل بنا دی جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ (دستوری تجاویز' از ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۸-۱۷)

اس تجویز سے آئینے کی طرح روشن ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) از روئے شریعت' امیر مملکت (یا کسی اور) کو یہ اختیار ہی حاصل نہیں کہ کسی کو بربنائے رحم رہا کر دے۔ یا اس کی سزائے موت کو کسی دوسری سزا میں تبدیل کر دے۔

(۲) البتہ رئیس مملکت' مصالح عامہ کی خاطر کسی کو معاف کر سکتا ہے یا بربنائے عدل' نہ کہ بربنائے رحم کسی کی سزائے موت کو دوسری سزا میں تبدیل کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب از روئے شریعت رئیس مملکت کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی کو بربنائے رحم معاف کر دے اور یہ اختیارات بادشاہوں[۱] نے شانِ خدائی دکھانے کیلئے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے تو کسی "صالح" اور پابند شریعت مسلمان کا ان بادشاہوں (یا حکام) سے رحم کی درخواست کرنا شریعت کی رو سے کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ کہدیا جائیگا کہ مودودی صاحب نے رحم کی درخواست نہیں کی۔ لیکن سوال یہ تو نہیں کہ انھوں نے رحم کی درخواست کی ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ از روئے شریعت' رحم کی درخواست دینا جائز ہے یا نہیں! مودودی صاحب فرما چکے ہیں کہ ایسا کرنا مطلقاً جائز نہیں کیونکہ یہ خدائی اختیارات ہیں جو حکام اپنے ہاتھ میں شانِ خدائی دکھانے کے لئے لے لیتے ہیں۔ لہذا جب محترم سلطان احمد صاحب نے مودودی صاحب سے لاہور جیل میں رحم کی درخواست کا ذکر کیا تھا تو انھیں صاف صاف کہدینا چاہئے تھا کہ "ایک مسلمان کیلئے رحم کی درخواست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لئے (ایک عامی مسلمان نہیں بلکہ) جماعت اسلامی کا امیر ہوتے ہوئے رحم کی درخواست کا خیال تمہارے دل میں کیسے پیدا ہو گیا"؟ اس کے ساتھ ہی انھیں کہدینا چاہئے تھا کہ "تم اور لوگوں کو بھی منع کرو کہ وہ ایسا خلافِ شریعت قدم نہ اٹھائیں۔ اگر کسی نے از خود ایسا کر بھی دیا تو میں اس سے بری الذمہ ہونگا اور اگر اس کے اثر کے ماتحت حکام نے مجھے بربنائے رحم رہا بھی کرنا چاہا تو میں رہا نہیں ہونگا۔" لیکن انھوں نے ایسا نہیں کہا۔ انھوں نے فقط اتنا کہا کہ میں خود رحم کی درخواست پر دستخط نہیں کروں گا اس لئے کہ برسر اقتدار طبقہ مجھ سے سیاسی انتقام لے رہا ہے۔ یعنی تم لوگ رحم کی درخواست کرو۔ اور لوگوں سے درخواست دلاؤ۔ اور اس طرح بالواسطہ (INDIRECTLY) بربنائے رحم میری رہائی کی کوشش کرو۔ لیکن میں خود ایسی درخواست پر دستخط نہیں کروں گا۔[۲] چنانچہ جماعت اسلامی کے موجودہ امیر نے اس حقیقت کا اظہار بھی کر دیا ہے کہ اور لوگوں کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں دلائی گئی ہیں۔

ہمیں اس وقت اس مسئلہ سے بحث نہیں کہ امیر مملکت کو رحم کے اختیارات ہونے چاہئیں یا نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ جب جماعت اسلامی کے امیر کے ارشاد کے مطابق یہ چیز خلاف شریعت ہے تو امیر صاحب کا رحم کی درخواست کے متعلق اس انداز کا رویہ اختیار کرنا اور جماعتِ اسلامی کے یہ تمام اقدامات کیا معنی رکھتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جب مودودی صاحب نے "دستوری تجاویز" میں وہ کچھ لکھا تھا تو انھیں

---

[۱] واضح رہے کہ جن بادشاہوں نے "شانِ خدائی دکھانے کیلئے" اس قسم کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے' مودودی صاحب انہی بادشاہوں کے عہد کی فقہ کو پاکستان کا قانون بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اسے "نظام شریعت" قرار دے رہے ہیں۔ یا للعجب!!

[۲] آپ ذرا اس کے نفسیاتی پہلو پر بھی غور کیجئے۔ رہائی بھی چاہتے ہیں اور لوگوں پر یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میں بڑا اصول کا پکا اور خوددار انسان ہوں۔ میں ان سے رحم کی درخواست نہیں کروں گا!

یہ تھوڑا معلوم تھا کہ یہ چیز خود ان کے اپنے خلاف جائے گی۔ اور جب اس کے بعد رحم کی درخواست کے متعلق یہ کچھ کہا ہے تو انہوں نے سمجھا ہوگا کہ جذبات کی اُس رَو میں جس میں لوگ بہا دیئے گئے ہیں کسی کو اس کا ہوش کہاں ہوگا کہ وہ سوچے کہ میں نے دستوری تجاویز میں کیا لکھ دیا تھا؟ یہ ہے ہمارے دَور کے "صالحین" کا رویہ! اور ایک صالحین وہ ہیں جن کے تذکار جلیلہ قرآن کے اوراق پر جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ انہی صالحین میں سے ایک "بندے" کے متعلق ارشاد ہے کہ جب شاہِ مصر اپنے خواب کی تعبیر سن کر خوش ہوا تو اس نے کہا کہ یوسفؑ کو جیل خانہ سے نکال لاؤ۔ افسر متعلقہ اس شاہی فرمان کے ساتھ اس عبدِ صالح کے پاس پہنچا کہ اسے اس کی رہائی کا مژدہ سنائے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں اُس خدا کے بندے نے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ ارجع الی ربک فاسئلہ ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن۔ (۱۲:۵۰) "جاؤ۔ اس مژدہ جانفزا کو لیکر اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ۔ اور اس سے کہو کہ پہلے اس مقدمے کی ازسرِنو تحقیق کرائے جس میں مجھے سزائے قید دی گئی ہے اگر میں اس میں بے گناہ ثابت ہوں تو پھر جیل خانہ سے باہر آؤنگا اس طرح ترحم خسروانہ کی بنا پر یہ تحقیق کرائے بغیر کہ میں مجرم ہوں یا نہیں، اپنی رہائی نہیں چاہتا"۔[1]

ایک یہ صالحین تھے اور ایک ہمارے دَور کے "صالحین" ہیں کہ تیس تیس گز لمبے محضر نامے تیار کرائے جا رہے ہیں۔ ہزاروں تاریں دلوائی جا رہی ہیں۔ سینکڑوں ریزولیوشنز پاس کرائے جا رہے ہیں۔ گلی گلی اور کوچے کوچے ڈھول پٹوائے جا رہے ہیں۔ رحم کی درخواستیں دلوائی جا رہی ہیں کہ انھیں بلا تحقیق رہا کر دیا جائے۔ طلوع اسلام نے اپنی سابقہ اشاعت میں جو طریق کار تجویز کیا تھا وہ بعینہٖ وہی تھا جسے حضرت یوسفؑ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی یہ کہ اگر اس کا یقین ہو جائے کہ . . . . پہلی عدالت میں انصاف کے مختلف تضمنات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تو مطالبہ یہ کیا جائے کہ عدالت جدیدہ کے ذریعے، ان مقدمات کی ازسرِنو تحقیق کرائی جائے اور اس طرح جو ملزم بے گناہ ثابت ہوں انھیں رہا کر دیا جائے۔

لیکن جماعت اسلامی کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی۔ اسلئے کہ یہ بات قرآن اور عقل کے مطابق ہے اور ان کا مسلک عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے سیاسی دباؤ پیدا کرنا ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟
کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری!

---

[1] اس مقام پر ضمناً ایک بات یاد آگئی۔ آپ غور کیجئے کہ سیرت و کردار کا یہ کتنا اونچا مقام ہے جسے قرآن نے بیان فرمایا ہے۔ لیکن بخاری میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس وقت بادشاہ کا پیغامبر اس خوشخبری کو لیکر حضرت یوسفؑ کے پاس آیا ہے، اگر میں حضرت یوسفؑ کی جگہ ہوتا تو فوراً جیل خانے سے نکل کر اس کے ساتھ ہو لیتا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ حدیث کسی یہودی نے یہ بتانے کے لئے وضع کی ہے کہ دیکھو! ہمارے رسول (حضرت یوسفؑ) کی سیرت کیا ہے اور تمہارا رسول (نبی اکرمؐ) کیا کہتا ہے کہ میں اس مقام پر کیا کرتا؟ اس یہودی نے تو یہ روایت وضع کر ہی دی تھی لیکن مسلمانوں کو دیکھئے کہ ہزار برس سے اسے سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ کتنی بڑی سازش تھی جس کا یہ شکار ہو رہے ہیں۔ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ انھیں اس طرف متوجہ کرتا ہے تو لٹھ لیکر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کیونکہ اس سے ملاکی روٹیوں میں فرق آجاتا ہے۔

مسلمانوں میں ملوکیت کی ابتداء

تاریخ کی روشنی میں

(۲)

حضرت علیؓ نے یہ موقف کیوں اختیار کیا تھا؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جسے حل کر لینا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی شخصیت علم وفضل کے لحاظ سے صحابہ میں کوئی معمولی ہستی نہیں تھی۔ قرآن کریم کا یہ صاف وصریح اصولی حکم کہ وامرھم شوریٰ بینھم اگر دوسرے صحابہ کے سامنے اتنا واضح تھا تو وہ حضرت علیؓ کی نگاہوں سے کیسے اوجھل ہوگیا اور زندگی بھر کیونکر اوجھل رہا۔ انھوں نے خلافت کو اگر وراثت بنانا چاہا تو آخر کس دلیل کی بنا پر کیا وہ بلا کسی دلیل کے محض جاہ واقتدار کی خواہش کے ماتحت امت میں یہ خوفناک تفرقہ ڈالنا چاہتے تھے؟

حاشا وکلا! ہمارا ہرگز یہ خیال نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں تاریخی ذخائر میں حضرت علیؓ کی کسی ایسی دلیل کا نشان نہیں ملتا جو ان کے مقصد کے لئے صریح ہو۔ تاہم اتنی بات یقینی ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہوگی خواہ ان کی وہ دلیل درحقیقت صحیح نہ ہو اور وہ اپنے اجتہاد میں غلطی ہی کر رہے ہوں لیکن ایسا یقین کر لینے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں کہ وہ بلا کسی دلیل کے محض جاہ اقتدار کی خاطر خلافت کو موروثی قرار دے رہے تھے۔

حضرت علیؓ کے موقف پر جہانتک ہم نے غور کیا ہے اور تاریخی شہادتیں جہانتک ہماری رہنمائی کرتی ہیں ایسا نظر آتا ہے کہ

(الف) حضرت علیؓ کے خیال میں وامرھم شوریٰ بینھم کا اصولی حکم انتخاب خلیفہ سے متعلق نہیں تھا۔

(ب) بلکہ حکومت کے نظم ونسق سے متعلق تھا۔

یعنی ان کے نزدیک غالباً وامرھم شوریٰ بینھم کے معنی یہ نہیں تھے کہ امیر ملت کا انتخاب بھی باہمی مشاورت سے کیا جائیگا بلکہ صرف یہ معنی تھے کہ امیر ملت اس کا پابند رہے گا کہ وہ حکومت کے معاملات کے فیصلے امت کے اہل الرائے حضرات سے مشورہ کر کے فیصل کرے۔ انھوں نے غالباً یہ اجتہاد خود رسول اللہؐ کی امارت سے کیا ہوگا۔ انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلعم ملت کے مشورہ سے امیر منتخب نہیں ہوئے تھے بلکہ بحیثیت رسول ہی کے آپ خود بخود امیر بھی تھے۔ البتہ اپنے امیر ہونے کی حیثیت میں آپ اس پر مامور تھے کہ ملت کے معاملات کا تصفیہ صحابہؓ کے مشورہ سے فرمائیں۔ لہٰذا اس مثال کو سامنے رکھ کر حضرت علیؓ نے سوچا ہوگا کہ رسول اللہؐ کے بعد آپ کے جانشین کا تقرر بھی ملت کے مشورہ اور انتخاب سے نہیں ہوگا بلکہ آپ کے بعد آپ کے خاندان میں جو قریب ترین شخص ہوگا وہی خلیفہ ہو جائے گا۔ البتہ جیسا کہ رسول اللہؐ مشورہ کے پابند تھے آپ کا جانشین بھی اس کا

پابند رہے گا کہ وہ امور مملکت کو باہمی مشاورت سے سرانجام دے۔

حضرت علیؓ کا خیال یہی تھا اور وہ اپنے اس خیال پر قطعاً مطمئن اور سختی کے ساتھ جمے ہوئے تھے لیکن دور دراز علاقوں میں جو داعی اس تحریک کے لئے کام کر رہے تھے انھیں دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں یقیناً دشواریاں پیش آتی تھیں اور لوگوں سے بحث و مباحثہ کرنے میں قدم قدم پر انھیں اپنی اس دلیل کی کمزوری محسوس ہوتی تھی۔ پوچھنے والے پوچھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم تو اللہ کے رسول تھے لہٰذا بلا کسی کے منتخب کئے ہوئے آپ خود ہی امیر بھی تھے لیکن آپ کا جانشین تو خدا کا رسول نہیں ہے کہ وہ بھی بلا کسی کے منتخب کئے ہوئے خود ہی امیر بن جائے۔ اس لئے حضرت علیؓ کے داعیوں کو اپنی دلیل کی کمزوری کا جب احساس ہوا تو انھوں نے وصی رسول اللہ اور خلیفۂ منصوص وغیرہ کے عقائد ایجاد کئے جن سے خلیفہ کا مقام بھی رسالت کے مقام سے ملا دیا گیا۔ کبھی یہ کہا گیا کہ آپ رسول اللہ صلعم کے وصی تھے۔ کبھی یہ کہا گیا کہ رسول خدا کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے ایسے ہی امام بھی خدا ہی کی طرف سے منصوص ہوتا ہے جیسا امت کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رسول پر جبکہ وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہو ایمان لائے ایسے ہی امت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس امام کو بھی تسلیم کرے جو خدا کی طرف سے اس کی امارت کے لئے متعین ہو۔ نیز جیسا کہ رسول، بہر حال رسول رہتا ہے خواہ اس پر ایک آدمی بھی ایمان نہ لائے۔ ایسے ہی امام بھی بہر حال امام رہتا ہے چاہے اسے ایک آدمی بھی تسلیم نہ کرے۔ حتیٰ کہ جیسا کہ رسول معصوم ہوتا ہے امام بھی معصوم ہوتا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان عقائد کی بنا پر امامت و خلافت کا مقام قطعاً وہی بنا دیا گیا ہے جو خود رسالت کا مقام تھا جن علاقوں میں یہ داعی کام کر رہے تھے وہ تمام تر نو مسلم علاقے تھے اور اسلامی تعلیمات سے کما حقہ بہرہ یاب نہیں ہو سکے تھے وہ ابھی ابھی شرک و کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئے تھے اس لئے ان عقائد کو تسلیم کر لینے میں انھیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

ہمیں یقین ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے داعیوں کو ان عقائد کی تعلیم ہرگز ہرگز نہیں دی ہوگی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ کی زندگی اور علم میں اس قسم کا پروپیگنڈا ہوتا رہا۔

یہ بہت بڑی تحریک تھی

حضرات صحابہؓ کے اس والہانہ عشق کو تصور میں لائیے جو ان کو رسول اللہ صلعم کے ساتھ تھا کہ کہیں آپ کا پسینہ گرتا تو صحابہؓ اپنا خون بہانے کیلئے تیار رہتے تھے۔ اور رسول اللہ صلعم کی اس محبت کا تصور کیجئے جو آپ کو اپنی چہیتی بیٹی فاطمہؓ سے تھی جس کی خوشی سے رسول اللہؐ کو خوشی اور جس کی تکلیف سے رسول اللہ صلعم کو تکلیف ہوتی تھی۔ کہیں باہر تشریف لیجاتے تو سب سے آخر میں ان سے رخصتی ملاقات کر کے تشریف لیجاتے۔ کہیں سے آتے تو آکر سب سے پہلے ان سے ملتے۔ ان کے بیٹوں کو رسول اللہ اپنا بیٹا کہتے اور اپنے کندھوں پر چڑھائے پھرتے۔ پھر دوسری طرف تصور کیجئے اس علی مرتضیٰؓ کا، جو رسول اللہؐ کے اس چچا ابو طالب کے بیٹے تھے جنھوں نے اللہ کے رسول کو اپنے بیٹوں کی طرح پالا پوسا اور جوان کیا تھا اور جو مرتے دم تک باوجود اپنے کفر کے محمدؐ کا دم بھرتے رہے۔ جسے رسول اللہ صلعم نے اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کیا، جسے رسولؐ اللہ مکہ سے رات کو نکلتے وقت اپنی چارپائی پر لٹا کر آئے تھے۔ جسے رسول اللہ صلعم نے اپنی چہیتی بیٹی بیاہی تھی۔ وہ خلافت کو

اپنا حق سمجھتے ہیں اور کبار صحابہ میں سے چند ممتاز صحابہؓ ان کے ہمنوا ہیں۔ اُدھر ان کو یہ آزادی حاصل ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے مکان میں جو مسجد نبوی سے اتنا متصل تھا کہ مسجد اور مکان کے درمیان صرف ایک قدآدم دیوار حائل تھی۔ (اور یہ مسجد نبوی ہی اس وقت کا دارالامارت تھی)۔ اس مقصد کے لئے مجالس منعقد کرتے تھے۔ وہ حضرت فاطمہؓ کو ساتھ لیکر انصار کی مجلسوں میں گشت کر سکتے تھے۔ سمجھانے بجھانے کے بعد جب خلیفۂ وقت مایوس ہو جاتا ہے تو یہانتک کہدیتا ہے کہ اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔

ذرا انسانی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انصاف کے ساتھ غور کیجئے کہ حضرت علیؓ کے خلافت کے حقدار ہونے کی تحریک کوئی معمولی تحریک نہیں تھی۔ اگر اس کے مقابلہ میں صدیق اکبرؓ جیسا پہاڑ نہ ہوتا تو اس کے سہارے ایسا انقلاب برپا کیا جا سکتا تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر رسول اللہ صلعم کے بعد حضرات صحابہ اور عامۂ مسلمین پر صدیق اکبرؓ کی ہستی کیا اثرات رکھتی تھی اس کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ باوجود صدیق اکبرؓ کی نرم پالیسی کے یہ تحریک سب کچھ کر لینے کے باوجود کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکی۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر حضورؐ کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ کے بجائے کوئی دوسرا شخص خلیفہ منتخب ہو گیا ہوتا جسے صدیق اکبرؓ جیسا اثر و رسوخ حاصل نہ ہوتا تو وہ اس سیلاب کا کسی صورت سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ صدیق اکبرؓ کی نرم پالیسی اختیار کرتا تو اسے یقیناً حضرت عثمانؓ کی طرح خود اپنی گردن دینی پڑتی اور اگر وہ عمر فاروقؓ کی سخت گیر پالیسی اختیار کرتا تو یزید بن معاویہ کی طرح اپنے مقابل کی گردن لینی پڑتی۔ صدیق اکبرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کے عہد میں ان حضرات نے کوئی عملی سرگرمی نہیں دکھائی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت علیؓ اور بنو ہاشم کی یہ خاموشی کسی رائے کی تبدیلی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے محض نامساعد حالات کی بنا پر تھی ورنہ خیالات اب بھی وہی تھے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں بنو ہاشم کی رائے

ابن جریر طبری نے حضرت عمرؓ کا ایک مکالمہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

عمرؓ نے کہا: ابن عباسؓ! سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ "زہیر ابن ابی سلمیٰ"۔ عمرؓ بولے "اس کا کچھ کلام سناؤ جس سے معلوم ہو سکے کہ تم صحیح کہتے ہو"۔ میں نے کہا "بنو عبداللہ بن غطفان کے خاندان کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"اگر بنا بر شرافت آفتاب کے اوپر بیٹھا جا سکتا ہے تو وہ ایسا خاندان ہے کہ اپنی اور اپنے بانی کی شرافت کی وجہ سے وہ آفتاب کے اوپر نشیمن بنا لیں۔ یہ وہ خاندان ہے کہ اگر تو ان کا نسب نامہ بیان کرنا شروع کرے تو ان کا باپ سنان (نیزہ) ہے۔ وہ خود بھی پاک ہیں اور جسقدر اولاد انھوں نے پیدا کی ہے وہ سب بھی پاک ہے۔

بحالتِ امن وہ انسان ہوتے ہیں اور بحالتِ جنگ جنّات۔ جب وہ کسی میدان میں اکٹھے ہو جائیں تو روز روشن کو شب تار بنا دیتے ہیں۔

خدا کی تمام نعمتوں کے بارہ میں ان پر حسد کیا جاتا ہے۔ جن نعمتوں میں لوگ ان پر حسد کرتے ہیں خدا ان سے انھیں کبھی واپس نہ لے۔

حضرت عمرؓ نے اشعار کی تعریف کی اور فرمایا "رسول اللہ کی فضیلت اور بنو ہاشم کی آپ سے قرابت کی بنا پر میں اس قبیلۂ بنی ہاشم سے زیادہ ان اشعار کا کسی کو اہل نہیں پاتا"۔ میں نے عرض کیا "امیر المومنین! آپ نے بالکل بجا ارشاد فرمایا"۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا "ابن عباسؓ تمہیں معلوم بھی ہے کہ تمہاری قوم نے محمد صلعم کے بعد خلافت بنو ہاشم کو کیوں نہیں دی"؟ میں نے جواب دینا مناسب

نہیں سمجھا اور عرض کیا کہ اگر مجھے معلوم نہ ہوگا تو امیر المومنین مجھے بتا دیں گے۔" اس پر عمرؓ نے فرمایا" انھوں نے اسے ناپسند کیا کہ خلافت اور نبوت دونوں کو تم میں جمع کر دیں اور اس طرح تم خود اپنی قوم کو مغلوب و مقہور کر کے اپنی گردنیں اکڑا کر چلو ــــ لہذا قریش نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ ہی میں رکھا اور اس نے بالکل صحیح کیا۔" میں نے عرض کیا۔" امیر المومنین! اگر آپ مجھے اجازت دیں اور ناراض نہ ہوں تو میں کچھ عرض کروں۔" عمرؓ نے فرمایا" ہاں ہاں، ابن عباس! کہو" میں نے عرض کیا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ قریش نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس نے بالکل صحیح کیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر قریش اس معاملہ کو وہیں رکھتا جہاں خدا نے اسے رکھا تھا تو وہ راہ صواب پر ہوتا، نہ اسے کوئی واپس لیتا نہ اس پر حسد کرتا اور آپ کا یہ فرمانا کہ قریش نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ نبوت اور خلافت دونوں کو بنو ہاشم میں جمع کر دیں تو خدا نے اس کراہت کا ذکر کرتے ہوئے کچھ لوگوں کے متعلق یوں کہا ہے

ذالك بانهم كرهوا ما انزل الله فاحبط اعمالهم

خدا نے جو نعمت (وحی) محمدؐ پر نازل کی وہ ان لوگوں کو گوارا نہ ہوئی تو خدا نے ان کے اعمال غارت کر دیئے۔

حضرت عمرؓ نے کہا" افسوس افسوس۔ بخدا اے ابن عباس! تمہارے بارہ میں مجھے اس سے پہلے بھی کچھ باتیں پہنچتی رہی ہیں جن پر میں نے غور کرنا بھی پسند نہیں کیا مبادا اس سے تمہاری وقعت میری نگاہوں میں کم ہو جائے۔" میں نے عرض کیا" امیر المومنین! وہ باتیں کیا ہیں۔ اگر وہ سچی باتیں ہیں تو ان کی وجہ سے میری وقعت آپ کی نگاہوں میں کم نہ ہونا چاہیئے اور اگر وہ غلط ہیں تو مجھے اپنی صفائی کا موقع ملنا چاہیئے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا" میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ قریش نے خلافت سے تم لوگوں کو حسد اور ظلم کی بنا پر محروم کیا ہے۔" میں نے کہا" امیر المومنین! ظلم کے بارہ میں آپ کا فرمانا یہ تو ایک ایسی بات ہے جو جاہل و عاقل ہر شخص پر واضح ہو چکی ہے۔ رہ گیا حسد تو ابلیس نے بھی آدم پر حسد کیا تھا۔ ہم بھی آدم ہی کی اولاد ہیں جن پر آج حسد کیا جا رہا ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا" افسوس صد افسوس۔ اے بنو ہاشم تمہارے دلوں میں حسد ہی نے گھر کر لیا ہے جو تبدیل نہیں ہوتا اور عداوت اور فریب گھس کر رہ گیا ہے جو دور نہیں ہوتا۔" میں نے عرض کیا" امیر المومنین! ذرا ٹھہریئے۔ ان لوگوں کے دلوں پر آپ حملہ نہ کیجئے جن سے خود خدا نے گندگی کو دور کر دیا ہے اور اچھی طرح پاک کر دیا ہے۔ ان پر آپ حسد اور فریب کی تہمت نہ لگائیے کیونکہ رسول اللہ صلعم کا قلب بنی ہاشم کے دلوں ہی میں سے تھا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا" ابن عباسؓ! آئندہ میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا" بہتر ہے۔" جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو عمرؓ کو کچھ شرم آئی اور بولے" ابن عباسؓ! ٹھہرو، میں ہمیشہ تمہارے حقوق کا خیال رکھتا ہوں اور تمہاری خوشی کو پسند کرتا ہوں۔" میں نے عرض کیا" امیر المومنین! میرا آپ پر اور ہر مسلمان پر حق ہے جو اس حق کی حفاظت کرے گا وہ اپنا حصہ پائے گا اور جو اس حق کو ضائع کر دے گا وہ اپنا حصہ ضائع کرے گا۔"

اس کے بعد ابن عباسؓ اٹھ کر چلے آئے۔ (ابن جریر طبری ج ۳ ص ۲۹۰)

حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے اس مکالمے سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ خود حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی بنو ہاشم کے کیا خیالات تھے۔ حضرت عمرؓ کی ہیبت اور دبدبہ کو تصور میں لائیے اور پھر ابن عباسؓ جیسی صغیر سن اور نو عمر

شخصیت کا خیال کیجئے کہ جہاں بڑے بڑے صحابہؓ کو بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی یہ ہاشمی نوجوان کس جرأت و بیباکی کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ بنو ہاشم کے بڑے بوڑھے کیا کچھ نہیں کہتے ہوں گے اور اس عرصہ میں ان کے گھروں میں کیا کیا گفتگوئیں نہیں ہوتی ہوں گی۔

بہرحال اس مکالمہ سے آپ نے دیکھ لیا کہ بنو ہاشم کے خیال میں

(۱) حکومت اسی گھرانے میں رہنی چاہئے تھی جہاں خدا نے اسے رکھا تھا یعنی رسول اللہ صلعم اپنی حیات میں امیر ملت رہے تھے تو یہ امارت ہمیشہ اسی گھرانے میں رہنی چاہئے۔

(۲) قریش نے اگر یہ سمجھا کہ نبوت اور خلافت دونوں ایک گھرانے میں نہیں رہنی چاہئیں تو یہ ان کا ظلم اور حسد تھا۔

(۳) اس فیصلہ کا ظلم ہونا ایک ایسی بات تھی جو ابن عباسؓ کے خیال میں ہر جاہل و عاقل پر واضح ہو چکی تھی۔

(۴) اور حسد ہونا بالکل فطری چیز تھی۔ ابلیس نے بھی آدم پر حسد ہی کیا تھا اور بنو ہاشم بالآخر اسی آدم کی اولاد تھے۔

اور سب سے آخر میں "پیرزادگی" کا یہ نظریہ کہ

(۵) امیر المومنین آپ برادر ہر مسلمان پر میراث ہے جو اس حق کی حفاظت کرے گا وہ اپنا حصہ پائے گا اور جو اس کو ضائع کر دے گا وہ اپنا حصہ ضائع کر دے گا۔

اگرچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی بنو ہاشم کے خیالات وہی تھے جو حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں تھے مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ کا زمانہ ایک حد تک خاموشی اور سکون کے ساتھ گذر گیا۔ بنو ہاشم اور حضرت علیؓ نے اس دور میں بھی اگرچہ عدم تعاون کی پالیسی برابر جاری رکھی مگر کوئی عملی سرگرمی نہیں دکھلائی اور یہ خدا کا بہت ہی بڑا احسان تھا۔ ورنہ کون جانتا ہے کہ جو منظر کربلا کے میدان نے چالیس سال بعد دیکھا اسے حرۂ مدینہ کا میدان اس سے کہیں پہلے ہی نہ دیکھ چکا ہوتا۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آیا وہ طبعاً نرم دل تھے اور تقاضائے عمر کے مطابق وہ اس تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ان کے زمانے میں تحریک نے ایک منظم اور عملی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

حضرت عثمانؓ کا انتخاب اور حضرت علیؓ کا طرزِ عمل

حضرت عمرؓ نے اپنی آخری وقت میں انتخاب خلیفہ کا مسئلہ چھ آدمیوں کے مشورہ پر چھوڑا تھا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ چھ آدمی صرف مشیر ہی نہیں تھے بلکہ خلافت کے لئے بھی نامزد تھے۔ اس امر نے ہر شخص کے دل میں خلافت کی خواہش پیدا کر دی اور ہر شخص نے اپنی اپنی جگہ یہ سمجھ لیا کہ میں بھی خلافت کا مستحق اور اہل ہوں۔ اسوقت جبکہ تیسرے خلیفہ کا انتخاب عمل میں آرہا تھا اس مجلس مشاورت کا نقشہ کیا تھا۔ اسے ذرا علامہ طٰہٰ حسین کے الفاظ میں سنئے:۔

اس میں شک نہیں کہ جو نظام شورائی حضرت عمرؓ نے تجویز فرمایا تھا وہ نقص بلکہ شاید شدید نقص سے خالی نہیں تھا۔ سب سے پہلی چیز جو اس نظام میں نظر آتی ہے وہ اس کی تنگی ہے۔ یہ مجلس صرف سات آدمیوں پر مشتمل تھی جن میں مشیر صرف ایک ہی تھا یعنی

عبداللہ ابن عمرؓ، جن کا خلافت میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ یہ مشیر ابھی جمع ہونے بھی نہیں پائے تھے کہ وہ بڑی مصیبت سامنے آگئی جو اس مجلس کی افادی حیثیت کو ختم کر دینے والی تھی۔ یعنی یہ چھ آدمی مشیر تھے اور سب کے سب ہی خلافت کیلئے نامزد بھی تھے۔ . . . . ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس بار کے اٹھانے کی زیادہ قدرت رکھتا ہے اور جن امور کی رعایت ایک امیر کے لئے ضروری ہو سکتی ہے وہ ان کو پورا کرنے کا زیادہ اہل ہے . . . . لوگوں نے دیکھا کہ ان شیوخ میں کسی صورت اتفاق نہیں ہو پاتا، ان میں سے ہر شخص خلافت کا خواہش مند ہے۔ حتیٰ کہ ابوطلحہؓ کو جو ان کی نگرانی پر مقرر تھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑا کہ جو کچھ پیش آیا وہ میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ خلافت کے خواہشمند ہونے کے بجائے اس گراں بوجھ کو ایک دوسرے کی گردن پر ڈالنے کی کوشش کریں گے . . . . اس نئی آفت پر سب سے پہلے عبدالرحمٰن بن عوفؓ متنبہ ہوئے اور انھوں نے اس کا علاج کرنا چاہا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہم میں سے کوئی ایک شخص اپنا نام واپس لے لے اور پھر اسی کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ مسلمانوں کیلئے کسی ایک کو امیر منتخب کر دے مگر اس تجویز پر سب کے سب خاموش ہو گئے۔ (الفتنۃ الکبریٰ۔ عثمان۔ ۱۔ صـ ۶۰-۶۳)

یہ تھا اس مجلس مشاورت کا نقشہ جو تیسرے خلیفہ کے انتخاب کیلئے مقرر کی گئی تھی اس کے بعد یہ بھی دیکھئے کہ حضرت عثمانؓ کا تیسرے خلیفہ کی حیثیت سے کس طرح انتخاب ہوا۔

آخر عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا۔ میں اپنا نام واپس لے لیتا ہوں۔ عثمانؓ نے کہا میں سب سے پہلے اس پر راضی ہوں کیونکہ میں نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے متعلق رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ زمین پر بھی امین ہیں اور آسمان پر بھی۔ اس کے بعد سب نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا لیکن علیؓ خاموش ہی رہے۔ آخر عبدالرحمٰنؓ نے کہا، ابوالحسن! تم کیا کہتے ہو؟ علیؓ نے فرمایا مجھے یہ عہد دو کہ تم حق کو ترجیح دو گے، خواہش نفس کا اتباع نہیں کرو گے، رشتہ داری کا کوئی لحاظ نہیں کرو گے اور محض امت کی خیر خواہی کو مدنظر رکھو گے۔ عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا، تم بھی مجھے عہد دو کہ جو شخص بعد میں تبدیل و تغیر کرنا چاہے اس کے خلاف تم سب میرا ساتھ دو گے اور جسے میں منتخب کردوں اس پر راضی رہو گے۔ مجھ پر اللہ کے لئے یہ عہد ہے کہ میں کسی رشتہ دار کا رشتہ داری کی وجہ سے کوئی خیال نہیں کروں گا اور محض مسلمانوں کی خیر خواہی کو مدنظر رکھوں گا۔ عبدالرحمٰن نے ان سب سے عہد لیا اور خود بھی عہد دیا۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا "تم کہتے ہو کہ قربت نبوی، سبقت ایمانی اور دینی قربانیوں کی بنا پر حاضرین میں سے تم سب سے زیادہ خلافت کے حقدار ہو لیکن مجھے بتاؤ کہ اگر خلافت تمہیں نہ مل سکے تو اس جماعت میں تم خلافت کا سب سے زیادہ کس کو حقدار سمجھتے ہو"۔ علیؓ نے فرمایا کہ "عثمانؓ کو"۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ سے تنہائی میں گفتگو کی اور کہا۔ تم کہتے ہو کہ میں بنو عبد مناف میں سب سے زیادہ معمر، رسول اللہ صلعم کا داماد، چچیرا بھائی ہوں، ایمانی سبقت و فضیلت بھی مجھے حاصل ہے۔ صحیح ہے، لیکن اگر تمہیں خلافت نہ مل سکے تو اس جماعت میں تم کس کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے ہو؟ انھوں نے فرمایا "علیؓ کو"۔ اس کے بعد حضرت زبیرؓ سے تنہائی میں گفتگو کی اور ان سے بھی وہی بات کی جو علیؓ اور عثمانؓ سے کی تھی، انھوں نے بھی فرمایا کہ "عثمانؓ کو" اس کے

بعد وہ حضرت سعدؓ سے ملے اوران سے گفتگو کی انھوں نے بھی عثمانؓ ہی کا نام لیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ سعدؓ کے پاس گئے اوران سے کہا اتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا۔ رسول اللہ صلعم کے ساتھ میں اپنے اس بیٹے کی قرابت داری کا واسطہ دیکر اور اپنے چچا حمزہؓ کی تم سے قرابت داری کا واسطہ دیکر سوال کرتا ہوں کہ تم عثمانؓ کے حق میں میرے خلاف عبدالرحمٰنؓ کے مددگار نہ ہو، کیونکہ میری قرابت داری کا حق اس سے کہیں زیادہ ہے جو عثمانؓ کو حاصل ہے

—— عبدالرحمٰنؓ دن رات اصحاب رسول اللہؐ اور افواج کے امراء اور شرفاء سے ملتے رہے جو اس وقت مدینہ منورہ میں آئے ہوئے تھے اور لوگوں سے مشورہ کرتے رہے وہ جس سے بھی ملتے تھے وہ عثمانؓ ہی کا نام لیتا تھا . . . .

. . . . . . عبدالرحمٰن نے کہا میں نے غور کیا اور سب سے مشورہ کیا لہٰذا اے لوگو! اپنے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی راہ نہ دو۔ اور حضرت علیؓ کو پکارا اور فرمایا "تم پر خدا کا عہد و میثاق ہے کہ تم کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور رسول اللہؐ کے بعد دونوں خلفاء کی سیرت کی پیروی کروگے"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ جہاں تک میرے علم اور طاقت کی یاوری ہوگی میں عمل کروں گا"۔ انھوں نے پھر حضرت عثمانؓ کو آواز دی اور ان سے بھی وہی بات کہی جو حضرت علیؓ سے کہی تھی انھوں نے فرمایا "ہاں"۔ چنانچہ عبدالرحمٰنؓ نے عثمانؓ سے بیعت کرلی۔ حضرت علیؓ نے کہا تم نے قطعاً زمانہ سازی سے کام لیا ہے۔ یہ پہلا دن نہیں ہے کہ تم نے ہمارے خلاف مظاہرہ کیا ہو۔ فصبر جمیل واللہ المستعان علیٰ ما تصفون۔ خدا کی قسم تم نے عثمانؓ کو محض اس لئے خلیفہ بنایا ہے کہ کل کو وہ تمہیں خلیفہ بنادے . . . . عبدالرحمٰنؓ نے کہا "اے علیؓ اپنے خلاف مجھے قدم اٹھانے پر مجبور نہ کرو۔ میں نے بہت غور کیا اور برابر لوگوں سے مشورہ کرتا رہا مگر وہ کسی کو بھی عثمانؓ کے برابر نہیں سمجھتے۔ حضرت علیؓ وہاں سے نکل کر چلدیئے اور ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ بہت اچھا سیبلغ الکتاب اجلہ (تحریر بہت جلد اپنی مدت کو پہنچ جائیگی

. . . . . . لوگوں نے عثمانؓ سے بیعت کرنے کے لئے اتنا ہجوم کیا کہ منبر کے قریب حضرت عثمانؓ نظر نہیں آتے تھے۔ نبی صلعم کے منبر پر عبدالرحمٰن بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے نچلے درجے پر حضرت عثمانؓ کو بٹھایا گیا تھا۔ لوگ ان سے برابر بیعت کر رہے تھے کہ حضرت علیؓ پیچھے کو مڑے تو عبدالرحمٰنؓ نے پکار کر کہا ومن نکث فانما ینکث علیٰ نفسہ ومن اوفیٰ بما عاھد علیہ اللہ فسیوتیہ اجرا عظیما (جو عہد شکنی کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس کے خلاف عہد شکنی کرتا ہے اور جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتا ہے تو اللہ اسے بڑا اجر دے گا) اس پر حضرت علیؓ لوگوں کو چیرتے ہوئے لوٹے اور بیعت کرلی مگر بیعت کرتے وقت بھی وہ برابر یہ کہتے جاتے تھے: "فریب ہے کتنا بڑا فریب"۔ (ابن جریر طبری ۲۹۵-۳۰۲/۳۲)

نظریۂ وراثت منظم تحریک کی شکل میں

یہ تھے وہ حالات وکوائف جن میں حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آیا اور یہ حالات ہی بڑی حد تک آنیوالے فتنوں کے ذمہ دار تھے۔ ان چھ حضرات میں سے ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ خلافت کا وہ زیادہ اہل تھا۔ حضرت عثمانؓ کی پالیسیوں پر شدت کے ساتھ یہ لوگ نکتہ چینی کرتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ ملت کے سرآوردہ افراد تھے اس لئے ان کی نکتہ چینیوں کا اثر دوسرے لوگ بھی قبول کرتے تھے مگر ان سب میں سب سے زیادہ اہم حضرت علیؓ کی مخالفت تھی

ان کی عظمت و وقار اور ساتھ ہی ایک خاص نظریہ کا حامل ہونا ان کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کئے ہوئے تھا۔ حضرت عثمانؓ چونکہ طبعاً نرم دل تھے اور تقاضائے عمر کے لحاظ سے بروقت سخت قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکے۔ اسلئے حضرت علیؓ اور ان کی جماعت کو ان کے زمانہ میں منظم طریقہ پر پروپیگنڈا کرنے کی آزادی حاصل ہو گئی۔ یہ جماعت خفیہ طریقہ پر پوری سرگرمی کے ساتھ حضرت عثمانؓ کو بدنام کرتے ہوئے اہل بیت رسولؐ کی محبت کے جاذب نگاہ اور مقدس نقاب میں ان عقائد کی تبلیغ کر رہی تھی کہ امامت منصوص ہوتی ہے جو اہل بیت نبی صلعم کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور نبی صلعم کے وصی حضرت علیؓ تھے۔ محمد صلعم جیسا کہ خاتم الانبیاؐ تھے حضرت علیؓ خاتم الاصیاؐ تھے۔

یہ پروپیگنڈا کون کر رہا تھا؟

یہ پروپیگنڈا کون کر رہا تھا اور کس کے اشارہ پر یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا؟ ہماری تاریخ میں یہ سوال نہایت ہی اہم ہے۔

انسان کی عام عادت ہے کہ وہ اپنی حرکتوں کو اپنے دشمنوں کے سر تھوپ کر خود کو اور دنیا بھر کو فریب دینے کی کوشش کیا کرتا ہے ہم کوئی گناہ کرتے ہیں اور نہایت معصومانہ انداز میں اسے فوراً شیطان کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہندو اور مسلمان اپنی اپنی حماقتوں کو نہایت آسانی کے ساتھ انگریز کے سر تھوپ کر خود بری الذمہ ہو جایا کرتے تھے۔ قرن اول میں یہودی قوم ایک ایسی ہی قوم تھی جس کی طرف ہر برائی آسانی کے ساتھ منسوب کر دی جا سکتی تھی اسلئے کہ وہ اسلام کی دشمنی میں سب سے پیش پیش رہتے تھے۔

چونکہ حامیانِ حضرت علیؓ کی سرگرمیاں تاریخ کے صفحات سے ملیا میٹ نہیں کی جا سکتی تھیں اور نہ ہی ان عقائد و مزعومات کو مٹایا جا سکتا تھا جو آج تک بھی مسلمانوں کے ایک فرقہ کا جزو دین بنے چلے آ رہے ہیں اس لئے اس کے لئے عبداللہ ابن سبا کی ایک فرضی ہستی گھڑ لی گئی جو دراصل یہودی تھا اور مسلمانوں میں انتشار و تفریق پیدا کرنے کے لئے محض منافقانہ طور پر مسلمان بن گیا تھا مگر یہ افسانہ سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں علامہ طٰہٰ حسین کی رائے غور کے قابل ہے:۔

ابن سبا ایک فرضی کردار ہے

میرا خیال ہے کہ جو لوگ ابن سبا کے معاملہ کو اسقدر اہمیت دیتے ہیں وہ خود اپنے اوپر بھی اور تاریخ پر بھی شدید ظلم کرتے ہیں سب سے پہلی چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان اہم مصادر میں جنھوں نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت کو بالتفصیل بیان کیا ہے کہیں ابن سبا کا تذکرہ نہیں ملتا۔ چنانچہ ابن سعدؒ جہاں حضرت عثمانؓ کی خلافت اور لوگوں کی مخالفت کا تذکرہ کیا ہے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی انساب الاشراف میں بلاذری نے اس تذکرہ کو چھیڑا ہے حالانکہ میری رائے میں اس واقعہ کے اہم ترین مصادر یہی دونوں کتابیں ہو سکتی تھیں جہاں واقعہ کی تمام جزئیات تک بالتفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔ اس ذکر کو محض طبری نے سیف بن عمر سے نقل کیا ہے اور بظاہر بعد کے آنیوالے مورخین اسے یہیں سے لے اڑے ہیں۔ (الفتنۃ الکبریٰ۔ عثمان۔ ۱۔ ص۱۳۲)

بہرحال ابن سبا کا یہ افسانہ تاریخی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس کی ہستی حقیقت ہو یا افسانہ، اس حقیقت میں تو کسی کو بھی کلام نہیں کہ یہ پروپیگنڈے پوری شد و مد کے ساتھ ہو رہے تھے اور خلافت راشدہ کے عہد ہی میں ہو رہے تھے۔ لوگ کیا صحابہؓ سے آ آ کر اس کے متعلق تحقیق کرتے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے کیا وصیت فرمائی تھی اور کیا حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے وصی تھے؟

صحیح بخاری میں طلحہ ابن مصرف کی یہ روایت موجود ہے کہ

میں نے عبداللہ ابن ابی اوفیٰ سے سوال کیا کہ کیا نبی صلعم نے کوئی وصیت فرمائی تھی۔ انھوں نے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ لوگوں پر تو وصیت کرنا فرض کردیا گیا ہو اور خود آپ ہی وصیت نہ فرمائیں۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہاں کتاب اللہ پر عمل کرنے کی آپ نے وصیت فرمائی تھی۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳)

اس سے بھی زیادہ صریح اسود بن یزید کی روایت ہے اور وہ بھی صحیح بخاری ہی میں موجود ہے کہ

حضرت عائشہؓ کے سامنے یہ بات بیان کی گئی کہ نبی صلعم نے حضرت علیؓ کو خلافت کی وصیت فرمائی تھی حضرت عائشہؓ نے فرمایا ایسا کون کہتا ہے؟ میں نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا کہ میں آپ کو اپنے سینہ پر سہارا دیئے ہوئے تھی۔ آپ نے پانی کا طشت منگایا اتنے میں ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہوگئے اور آپ کا انتقال ہوگیا کہ مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔ علیؓ کو آپ نے کب اور کیسے وصیت فرمادی (؟)

نظریہ وراثت کی فتح

حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت اور خصوصیت سے ساتھ آخری چھ سال نہایت پرآشوب گذرے اور بالآخر انہی لوگوں کے ہاتھوں جو مذکورہ بالا منظم تحریک کو چلا رہے تھے حضرت عثمانؓ کو چالیس دن کے شدید ترین محاصرہ کے بعد جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ اور انہی لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنا دیا۔ آپ نے دیکھا کہ انقلاب آیا اور کس طرح آیا۔ تقریباً ستائیس سال کے بعد اس نظریہ کو بالآخر فتح حاصل ہوئی کہ امر خلافت انتخابی اور شورائی نہیں بلکہ موروثی ہے۔ خلافت کے حقدار حضرت علیؓ تھے کیونکہ وہ رسول اللہؐ کے قریب تر رشتہ دار تھے۔ وہ رسول اللہؐ کے وصی تھے۔ امام منتخب نہیں ہوتا بلکہ منصوص ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اہل بیت ہی میں سے ہوتا ہے۔ یہ ایک نظریہ کی فتح تھی دوسرے نظریہ پر۔ ایک (Idiology) کی کامیابی تھی دوسری (Idiology) کے خلاف۔

مذکورہ بالا تصریحات سے آپ نے بخوبی دیکھ لیا کہ اس ستائیس سال کے عرصہ میں دو مختلف نظریات میں کیا کشمکش رہی اور بالآخر وہ کس طرح ایک نظریہ کی کامیابی پر منتج ہوئی۔ جس نظریہ کو کامیابی نصیب ہوئی وہ نظریہ کیا تھا؟ یہی کہ

(۱) خلافت شورائی نہیں بلکہ موروثی ہے۔

(۲) حضرت علیؓ چونکہ رسول اللہ صلعم کے قریبی عزیز تھے اسلئے وہ خلافت کے حقدار تھے۔

(۳) حضرت علیؓ رسول اللہؐ کے وصی تھے۔

(۴) امام منتخب نہیں بلکہ منصوص ہوتا ہے۔

(۵) امام منصوص صرف اہل بیت ہی میں سے ہوسکتا ہے۔

کیا صحابہؓ نے اس نظریہ کی کامیابی کو قبول کرلیا؟

بہرحال حضرت علیؓ خلیفہ بنا دیئے گئے جس نظریہ کے ماتحت یہ خلافت عمل میں لائی گئی تھی صحابہ اُسے بآسانی قبول نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ کبار صحابہؓ میں سے سرآوردہ لوگوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے ابن شہاب زہری سے نقل کیا ہے:-

بہت سے لوگ مدینہ منورہ سے شام کی طرف بھاگ گئے اور انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی۔ خود مدینہ منورہ میں قدامہ ابن مظعونؓ عبداللہ ابن سلامؓ اور مغیرہ ابن شعبہؓ نے بیعت نہیں کی۔ کچھ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ نے جبراً بیعت کی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زبیرؓ نے بیعت ہی نہیں کی۔ . . . . . عبداللہ بن الحسن کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو انصار نے حضرت علیؓ سے بیعت کر لی مگر ان میں سے کچھ لوگوں نے بیعت نہیں کی جن میں حسانؓ بن ثابت، کعب بن مالکؓ۔ سلمہ ابن مخلدؓ ابو سعید خدریؓ۔ محمد بن مسلمہؓ۔ نعمان بن بشیرؓ۔ زید بن ثابت۔ رافع بن خدیجؓ۔ اور فضالہ بن عبیدؓ۔ اور کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات شامل تھے اور یہ سب عثمانؓ کے ہواخواہوں میں سے تھے۔ (ابن جریر طبری ج ۳ ص ۴۵۲)

ابن خلدون نے ان تمام حضرات کے ساتھ مندرجہ ذیل ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔

سلمہ بن سلامۃ، ابن وقش، صہیب بن سنان، اسامہ ابن زید، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم (ابن خلدون ج ۲ ص ۴۰۲-۴۰۳)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت علیؓ سے بیعت نہ کرنے والے صحابہ میں سب کے سب اکابرین صحابہ ہیں۔ یہی حضرات مدینہ منورہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ اس کے بعد جمل اور صفین کی خونریز جنگیں پیش آئیں جو تاریخ کے مشہور واقعات میں سے ہیں لہٰذا ان کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اپنے عہدِ خلافت میں حضرت علیؓ کے خیالات

گذشتہ صفحات میں درجہ بدرجہ آپ دیکھتے آرہے ہیں کہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے آخری عہد میں اپنے حق خلافت کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے اور ان کی طرف سے ان خیالات کا اظہار کس طرح ہوتا رہا۔ اس کے بعد اب یہ دیکھئے کہ خود خلیفہ بن جانے کے بعد آپ کے کیا خیالات تھے۔ حضرت علیؓ کو اطلاع ملتی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور طلحہؓ و زبیرؓ ان کے خلاف لوگوں کو جمع کر رہے ہیں اور ان سے مقابلہ کرنے کے لئے وہ نکلتے ہیں۔ تو

آپ روانہ ہو گئے اور ربذہ تک پہنچ گئے۔ اور آپ کو اطلاع ملی کہ مخالفین ان سے پہلے بصرہ پہنچ چکے ہیں تو آپ نے ربذہ میں قیام فرمایا تاکہ مشورہ کریں کہ آئندہ کیا کرنا چاہئے۔ اسی اثنا میں آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ بھی پہنچ گئے اور انھوں نے حضرت علیؓ کو ملامت کی کہ وہ مدینہ منورہ سے کیوں نکلے اور وہ کیوں ہر دفعہ ان کی بات نہیں مانتے۔ حضرت علیؓ نے ان سے فرمایا کہ بتاؤ میں نے تمہاری کونسی بات نہیں مانی جو تم نے کہی ہو۔ حضرت حسنؓ نے کہا جب عثمانؓ کا محاصرہ کیا جا رہا تھا میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مدینہ منورہ سے نکل جائیں اور ان کے قتل کے وقت مدینہ میں موجود نہ رہیں۔ پھر جب وہ قتل ہو گئے تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب تک عرب کے وفود اور مختلف شہروں کی بیعت نہ آجائے آپ بیعت نہ لیں۔ پھر ان لوگوں کے خروج کے وقت میں نے کہا کہ آپ اپنے گھر میں بیٹھ رہئے تا آنکہ یہ لوگ آپس میں صلح کر لیں۔ مگر آپ نے میری ایک بات نہیں مانی۔ حضرت علیؓ نے کہا مدینہ سے نکل جانے کی تو کوئی راہ ہی نہیں تھی۔ جیسا عثمانؓ کا محاصرہ ہو رہا تھا ہمارا بھی محاصرہ تھا۔ رہ گئی بیعت تو ہمیں یہ ڈر تھا کہ خلافت ضائع ہو جائے۔ اہل حل وعقد مدینہ والے تھے نہ کہ سارے عرب اور تمام شہروں کے لوگ ۔۔۔

رسول اللہ صلعم کا انتقال ہوا تو آپ کے بعد میں ہی خلافت کا سب سے زیادہ حقدار تھا لیکن لوگوں نے دوسروں کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مجھے بھی ان کی پیروی کرنی پڑی۔ عثمانؓ کو لوگوں نے قتل کر دیا اور انھوں نے مجھ سے بخوشی بیعت کر لی۔ میں نے ان پر کوئی جبر نہیں کیا تو اب جو شخص مخالفت کریگا میں اپنے فرمانبرداروں کو ساتھ لیکر ان سے لڑوں گا۔ حتیٰ کہ خدا فیصلہ فرمائے کہ بہترین فیصلہ کرنے والا وہی ہے۔ رہا طلحہؓ اور زبیرؓ کے مقابلہ سے بیٹھ رہنا تو اگر میں ہی اس چیز کو نہیں دیکھوں گا کہ خلافت کی رو سے مجھ پر کیا لازم ہے تو اسے کون دیکھے گا۔ (ابن خلدون ج ۲ ص ۴۱۳-۴۱۴)

جنگ صفین کے موقعہ پر صلح کی کوشش کی جا رہی ہے اور امیر معاویہؓ کی طرف سے ایک وفد آتا ہے اس وفد کے سامنے حضرت علیؓ تقریر فرماتے ہیں:-

حمد و ثنا اور محمد صلعم کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت کا بیان کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے فرمایا۔ . . . . . عثمانؓ خلیفہ ہوئے لوگوں نے انھیں ناپسند کیا اور قتل کر دیا۔ پھر مجھ سے بیعت کر لی۔ اس ڈر سے کہ امت میں افتراق نہ ہو میں نے ان کی خواہش کو قبول کر لیا۔ دو آدمیوں (طلحہؓ و زبیرؓ) نے عہد شکنی کی اور تمہارے صاحب (معاویہؓ) نے مخالفت کی جسے میری جیسی ایمانی سبقت بھی حاصل نہیں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم اپنے نبی کے گھرانے کو چھوڑ کر اس کے متبع کیونکر بن گئے جو تمہارے لئے ہرگز مناسب نہیں تھا۔ میں تمہیں کتاب و سنت اور معالم دین کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ باطل کو مٹانے اور حق کو زندہ کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ وفد کے ممبران نے کہا "تم اس بات کی بھی شہادت دیتے ہو یا نہیں کہ عثمانؓ ظلماً قتل کئے گئے اور وہ مظلوم تھے؟" حضرت علیؓ نے جواب دیا "میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مظلوم تھے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم تھے۔

(ابن خلدون ج ۲ ص ۴۳۳)

یہ وفد کیوں کر ناکام لوٹا؟ ذرا اس کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

معاویہ نے حضرت علیؓ کی طرف حبیب بن مسلمہؓ شرجیل ابن السمط اور معن بن یزید بن الاخنسؓ کو بھیجا وہ حضرت علیؓ سے ملے حبیب بن مسلمہؓ نے گفتگو کی اور حمد و ثنا کے بعد حضرت علیؓ سے کہا۔ عثمانؓ ہدایت یافتہ خلیفہ تھے۔ کتاب اللہ پر عمل کرتے تھے اور اسی کے احکام کی طرف رجوع ہوتے تھے مگر تم لوگوں کو ان کی زندگی گراں گذری اور ان کی موت میں دیر دیکھی تو تم نے ان کو قتل کر ڈالا۔ اگر واقعی تم نے انھیں قتل نہیں کیا تو ان کے قاتلین کو ہمارے حوالہ کر دو پھر لوگوں کے معاملہ سے الگ ہو جاؤ جس پر ان کا اتفاق ہو جائے اسے وہ خلیفہ منتخب کر لیں۔" حضرت علیؓ نے سختی سے جواب دیا "اس معاملۂ خلافت سے تمہارا کیا سروکار خاموش رہو۔ تم اس سوال کے اہل نہیں۔" اس پر حبیب ابن مسلمہ نے کہا "تو پھر خدا کی قسم آپ مجھے وہیں دیکھیں گے جہاں مجھے دیکھنا آپ پسند نہیں کریں گے۔ (یعنی میدان جنگ میں) (ابن خلدون ج ۲ ص ۴۳۳-۴۳۴)

حضرت علیؓ کا زمانۂ خلافت از ابتداء تا انتہا باہمی آویزشوں اور جنگ و جدال ہی میں گذر گیا۔ تا آنکہ ایک خارجی ابن ملجم کے ہاتھوں ۴۰ھ میں آپ کو بھی جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

باپ کے بعد بیٹا

حضرت علیؓ زخمی ہوئے تو لوگوں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ حضرت علیؓ کا جانشین کون ہوگا۔ حضرت علیؓ جس نظریہ کے حامل تھے اور ان کی جماعت جس نظریہ کیلئے برابر کام کرتی آرہی تھی اس کے مطابق حضرت علیؓ کا جانشین ایک حد تک متعین ہی تھا مگر پھر بھی لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے دریافت کیا چنانچہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں :-

بیان کیا گیا ہے کہ جندب بن عبداللہ حضرت علیؓ کے پاس گئے اور ان سے دریافت کیا اور کہا: اے امیرالمومنین اگر آپ ہم میں نہ رہیں، خدانہ کرے کہ آپ نہ رہیں، تو پھر ہم حسنؓ سے بیعت کرلیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: میں نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ ہی اس سے منع کرتا ہوں۔ تم خود دانا و بینا ہو۔ (طبری ج ۴ ص ۱۱۲)

غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ یہی سوال جب حضرت عمرؓ سے ان کے زخمی ہونے کے بعد کیا گیا کہ آپ کے بعد ہم لوگ عبداللہ بن عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں تو انھوں نے اس تجویز پیش کرنے والے کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا تھا اور پھر فرمایا تھا:-

ہمیں تمہاری حکومتوں کی کوئی خواہش نہیں۔ میں نے اسے کچھ اچھا نہیں پایا کہ اپنے گھر میں سے کسی اور کے لئے بھی اس کی خواہش کروں اگر یہ اچھی چیز تھی تو ہم نے اس کا مزہ چکھ لیا اور اگر یہ کوئی بُری چیز تھی تو عمرؓ کے خاندان کے لئے اتنا ہی بہت کافی ہے کہ کل کو خدا کے سامنے ان میں سے صرف ایک آدمی ہی سے حساب لیا جائے۔ (العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام لسید قطب ص ۱۸۶)

چنانچہ حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی گئی۔ ابن جریر کا بیان ہے کہ

اسی سال میں یعنی ۴۰ھ میں خلافت کے لئے حسن بن علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بیعت کی وہ قیس بن سعد تھے۔ قیس نے کہا اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ سے کتاب اللہ عزوجل، سنت نبی اور مخالفین سے قتال پر بیعت کرتا ہوں۔ حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا، صرف کتاب اللہ اور سنت نبی پر بیعت کرو کیونکہ اس میں ساری شرائط آجاتی ہیں چنانچہ قیس نے بیعت کرلی اور وہ خاموش رہے اس کے بعد باقی سب لوگوں نے بیعت کرلی۔ (طبری ج ۴ ص ۱۲۱)

اس کے بعد لوگوں نے اصرار کرنا شروع کیا کہ شام پر حملہ کیا جائے اور جس کام کو حضرت علیؓ ادھورا چھوڑ گئے ہیں اس کی تکمیل کی جائے حضرت حسن طبعاً جنگ و جدال سے متنفر تھے مگر لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آخر راضی ہوگئے اور ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ شام کی طرف پیشقدمی شروع کردی گئی تا آنکہ مدائن میں آپ کا لشکر خیمہ انداز ہوگیا۔ اُدھر سے حضرت امیر معاویہؓ بھی اپنی فوجیں لیکر بالمقابل خیمہ انداز ہوگئے۔ ابھی جنگ شروع نہیں ہوپائی تھی کہ حسب بیان ابن خلدون

جب حسنؓ مدائن میں خیمہ انداز ہوگئے تو ایک دن یہ خبر اڑ گئی کہ قیس ابن سعد (مقدمۃ الجیش کے کمانڈر) قتل ہوگئے۔ لوگ غصہ سے بے قابو ہوگئے اور ایک دوسرے پر آپس ہی میں حملے کرنے لگے۔ یہ لوگ حسنؓ کے خیموں تک پہنچ گئے اور جو کچھ آس پاس ملا سب لوٹ لیا حتیٰ کہ جس فرش پر حسنؓ بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی نیچے سے زبردستی کھینچ لیا۔ اور جو چادر آپ اوڑھے ہوئے تھے وہ بھی ان سے چھین لی اور کسی نے ان کی ران پر نیزہ کا وار کیا۔ آخر بنو ربیعہ اور بنو ہمدان بیچ میں آئے اور ان کو بچایا۔ یہی لوگ انھیں ایک چارپائی یا تخت پر ڈالکر مدائن لیگئے اور وہاں قصر میں آپ نے قیام فرمایا۔ حضرت حسنؓ کی حکومت تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ (ابن خلدون ج ۲ ص ۴۵۵)

خلافت فروخت کی جاتی ہے

مذکورہ بالا اقتباس میں آپ نے اہل عراق کی وفاداری کا نقشہ دیکھ لیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں چالیس ہزار سپاہی وہ تھے جنھوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھوں پر موت کی بیعت کر رکھی تھی اور جو قیس بن سعد ہی کی کمانڈ میں تھے۔ بالآخر حضرت حسنؓ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس قوم سے فلاح کی کوئی امید رکھنا پرلے درجے کی حماقت ہے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔ اس دست برداری کی تفصیل ابن خلدون کے الفاظ میں یہ ہے:-

آخر امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ وہ خلافت سے دست بردار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ کوفہ کے بیت المال میں جسقدر رقم ہے وہ ان کو دیدی جائے۔ اس رقم کی مقدار پانچ کروڑ تھی اور نیز یہ کہ دارابجرد کا خراج جو فارس کا ایک حصہ ہے حضرت حسنؓ کو ادا کیا جاتا رہے اور تیسری شرط یہ تھی کہ حضرت حسنؓ کے سامنے حضرت علیؓ کو برا بھلا نہ کہا جائے۔ ان کے بھائی حضرت حسینؓ اور عبداللہ جعفرؓ کو خبر ہوئی تو انھوں نے حضرت حسنؓ کو اس پر بہت ملامت کی مگر انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ (ابن خلدون ج ۲ ص ۲۵۶)

ہمارے دل میں حضرت امام حسنؓ کا پورا پورا احترام ہے۔ چار سال سے ملت میں جو خون خرابہ ہو رہا تھا انھوں نے اپنی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی سے کام لیکر ملت کو پھر ایک مرکز پر جمع کر کے اسلام کی جو گرانقدر خدمت انجام دی ہے وہ ہزار مستحق تحسین و آفریں ہے مگر بہت کچھ کوشش کے باوجود بھی ہم اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکے کہ حضرت امام حسنؓ نے اس دست برداری کی جو گراں قیمت طلب کی ہے اس کو کیا کہا جائے بجز اس کے خلافت ان حضرات کے نزدیک چونکہ ایک وراثتی چیز تھی اور ان کی ملکیت تھی اس لئے اس ملکیت کو فروخت کر کے اس کی قیمت طلب کر لی گئی۔ ابن جریر طبری نے اس بیع و فروخت کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ اور بھی دلچسپ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

امام حسنؓ نے معاویہؓ سے خط و کتابت کی اور ان کے پاس اپنی شرطیں بھیجدیں اور لکھدیا کہ اگر آپ یہ چیزیں منظور کر لیں تو میں آپ کا مطیع و فرمانبردار ہوں اور آپ پر لازم ہے کہ آپ ان شرائط کو پورا کریں۔ حسنؓ کا یہ خط معاویہؓ کے ہاتھوں میں اس وقت پہنچا جبکہ معاویہؓ اس سے پہلے ایک سادہ کاغذ پر اپنی مہر لگا کر حسنؓ کے پاس بھیج چکے تھے اور لکھ چکے تھے کہ اس کاغذ پر جس پر میں نے اپنی مہر لگا دی ہے جتنی شرطیں تمہارا جی چاہے لکھدو مجھے سب منظور ہوں گی۔ جب یہ کاغذ حسنؓ کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کاغذ پر ان شرطوں سے کئی گنا زیادہ شرطیں لکھ لیں جو وہ اس سے پہلے حضرت معاویہؓ کو بھیج چکے تھے اور اس کاغذ کو اپنے پاس محفوظ رکھ چھوڑا۔ جب معاویہؓ اور حسنؓ کی ملاقات ہوئی تو حسنؓ نے معاویہؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان شرطوں کو پورا کریں جو انھوں نے اس کاغذ پر لکھ چھوڑی ہیں جس پر معاویہؓ کی مہر تھی۔ لیکن معاویہ نے ان شرطوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا جو کچھ شرطیں تم مجھے اولاً لکھ چکے ہو وہ میں تمہیں اسی وقت دیچکا ہوں جب تمہارا خط میرے پاس پہنچا (اب اس کے بعد مزید مطالبے کرنے کا تمہیں حق نہیں) مگر امام حسنؓ کا کہنا یہ تھا کہ میں نے یہ شرطیں اسی وقت تو لکھی ہیں جب تمہارا مہر شدہ کاغذ مجھے ملا ہے اور تم نے مجھے یہ عہد دیا تھا کہ اس کاغذ میں جتنی شرطیں ہوں گی تم ان کو پورا کرو گے۔ چنانچہ اس بارہ میں دونوں میں اختلاف رہا اور معاویہؓ نے

اس کاغذ والی شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہیں کی۔ (طبری ج ۴ ص ۱۲۴)

اسی قسم کا ایک مہر زدہ سادہ کاغذ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے قیس بن سعد کو بھی بھیجا ہے اور اس کو بھی یہی لکھا ہے کہ جتنی شرطیں تمہارا جی چاہے اس کاغذ پر لکھ دو مجھے تمام شرطیں منظور ہوں گی مگر طبری کے بیان کے مطابق

جب معاویہؓ نے یہ کاغذ بھیجا تو قیس نے اس میں اپنے لئے اور حضرت علیؓ کی پارٹی کے لئے ان خونوں اور اموال پر امان کا مطالبہ کیا جو ان کے ہاتھوں لوگوں نے برداشت کئے تھے۔ اور اس کاغذ میں معاویہؓ سے اس نے از قسم مال کچھ بھی طلب نہیں کیا چنانچہ معاویہؓ نے اس کی شرطیں بھی منظور کر لیں اور وہ بھی مع اپنے ساتھیوں کے ان کی اطاعت میں داخل ہو گیا۔ (طبری ج ۴ ص ۱۲۵)

نتائج تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ

(۱) اسلام میں نظام اجتماعی تھیاکریسی نظام نہیں تھا جس کی کلیات و جزئیات وحی الٰہی سے متعین شدہ ہوں — بلکہ

(۲) قرآنی اصول کی روشنی میں جزئیات کی تعیین اسلامی معاشرہ کو اپنے تفقہ اور اجتہاد سے کرنی تھیں۔

(۳) رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد صحابہ کی اکثریت انتخاب خلیفہ کو شورائی سمجھتی تھی مگر حضرت علیؓ حضرت عباسؓ اور چند دوسرے صحابہ کا یہ خیال تھا کہ خلافت ایک وراثتی چیز ہے اور رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد وہ حضرت علیؓ کا حق تھی۔

(۴) حضرت علیؓ اور ان کے ہمنواؤں نے صدیق اکبرؓ سے بیعت نہیں کی اور وہ برابر اپنے مزعومہ حق کے لئے کوشش کرتے رہے۔

(۵) چھ ماہ بعد جب حضرت فاطمہؓ کی وفات ہو گئی اور لوگوں کے چہرے بدلے ہوئے دیکھے تو مجبوراً بیعت کی گئی۔ مگر عدم تعاون و موالات کی پالیسی پر عمل درآمد رہا۔

(۶) حضرت عمرؓ کے عہد میں ان کی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے کوئی عملی سرگرمی دکھلائی نہیں جا سکی تاہم خیالات وہی تھے جو صدیق اکبرؓ کے عہد میں تھے۔

(۷) حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس نظریہ نے عملی تحریک کی صورت اختیار کر لی جس کا مرکز مصر، کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیاں تھیں۔ یہاں کے نوجوان نومسلم اور ناتربیت یافتہ لوگوں میں اس نظریہ کو اہل بیت کی محبت کے مقدس نقاب میں مقبول بنایا گیا۔

(۸) اس تحریک کو ابن سبا یہودی منافق کے سر تھوپنا ایک تاریخی فریب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

(۹) اس تحریک کے علم برداروں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے اور انہی کے ہاتھوں حضرت علیؓ خلیفہ بنائے گئے۔

(۱۰) بہت سے صحابہ شام بھاگ گئے۔ بہت سے مکہ اور وہاں سے بصرہ چلے گئے جو صحابہ مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے ان میں سے بھی سرآور صحابہؓ نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی اور حضرت علیؓ کا زمانہ خلافت کشت و خون ہی میں گذرا۔

(۱۱) بالآخر اس جماعت کے ایک فرد کے ہاتھوں جو پہلے حضرت علیؓ کے ساتھ تھی مگر واقعۂ تحکیم کے بعد ان سے الگ ہو کر خارجی جماعت کے نام سے مشہور ہوئی حضرت علیؓ شہید کر دیئے گئے۔

(۱۲) حضرت علیؓ کے بعد امام حسنؓ کو خلیفہ بنایا گیا اور حضرت علیؓ نے اس تجویز کی مخالفت نہیں فرمائی اور مسلمانوں میں سب سے پہلے

باپ کے بعد بیٹے کو خلیفہ بنایا گیا۔

(۱۳) امام حسنؓ نے اپنی جماعت کے ہاتھوں لٹ کر اور زخمی ہو کر جب دیکھا کہ اس جماعت پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تو انھوں نے امیر معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہونے کا ارادہ فرمایا۔

(۱۴) اس دست برداری کی قیمت وصول کی گئی جو پانچ کروڑ روپیہ نقد اور فارس کے ایک حصہ دار الجرد کے خراج کی صورت میں تھی۔

خلافت کیونکر ملوکیت میں تبدیل ہوئی؟

یہ ہیں وہ نتائج جن تک ہماری تاریخ ہمیں پہنچاتی ہے اور یہی ہیں وہ نتائج جو خلافت کے تصور کو ملوکیت میں تبدیل کر دینے کا باعث ہوئے۔ یہ نظریہ اسلامی تصور خلافت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ نظریہ خلافت کا نہیں بلکہ دراصل ملوکیت کا نظریہ تھا۔ ملوکیت اور خلافت میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ خلافت میں عوام اپنا امیر اپنی مرضی سے منتخب کرتے ہیں اور ملوکیت میں کسی کے انتخاب کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا خود بخود بادشاہ بنتا چلا جاتا ہے۔ بادشاہت ایک خاندان کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی کچھ یہاں تھا۔ امامت ایک خاص خاندان یعنی اہل بیت کے ساتھ مخصوص تھی اور یکے بعد دیگرے اسی خاندان میں قریب ترین فرد کی طرف منتقل ہوتی تھی مگر اس میں اور ملوکیت میں ایک فرق یہ تھا کہ ملوکیت محض دنیوی اقتدار تک محدود ہوتی ہے مگر یہ امامت ساتھ ہی مذہبی تقدس کا جامہ بھی پہنے ہوئے تھی۔ یہاں رسالت و نبوت کی طرح امامت بھی خدا کی طرف سے منصوص تھی۔ کسی امام کے خلاف کسی قسم کی تنقید کا بھی کسی کو حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ رسول کی طرح امام بھی معصوم ہوتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ملت اسلامیہ کی اکثریت نے بالکلیہ اس نظریہ کو قبول نہیں کیا بلکہ یہ عقائد و نظریات صرف ایک فرقہ تک ہی محدود رہے لیکن قرن اول کے مسلمانوں میں ملوکیت کے خلاف جو سخت ترین استنکار پایا جاتا تھا وہ برابر مضمحل ہوتا چلا گیا اور غیر شعوری طور پر اس نظریہ کے اثرات اپنا کام کرتے چلے گئے۔ حضرت علیؓ کی جماعت نے اس مخصوص نظریہ کے ماتحت امارت کا نام خلافت نہیں رکھا تھا بلکہ امامت رکھا تھا۔ سُنّیوں نے اس نظریۂ امامت کو تو تسلیم نہیں کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ کٹر سے کٹر سنّی کے زبان و قلم سے حضرت علیؓ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ وغیرہ حضرات کے لئے خلیفہ کا لفظ نہیں نکلتا بلکہ غیر اختیاری طور پر وہ ہمیشہ ان کے لئے امام کا لفظ ہی استعمال کرتا ہے آپ نے کبھی کسی سنی کو بھی خلیفہ علی، خلیفہ حسن، خلیفہ حسین کہتے نہیں سنا ہو گا بلکہ وہ غیر شعوری طور پر بے اختیارانہ ہمیشہ امام علی رضؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ کے الفاظ ہی استعمال کرتا ہے۔ حضرات صحابہ کا جب نام لیا جاتا ہے تو تمام سُنّی ان کے لئے رضی اللہ عنہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور جب کبھی کسی رسول یا نبی کا نام لیتے ہیں تو ان کے لئے علیہ السلام کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام وغیرہ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ۔ مگر آپ دیکھیں گے کہ کٹر سے کٹر سنی کے زبان و قلم سے بھی ان تینوں حضرات کے لئے جو بہر حال رسول اللہ صلعم کے صحابی ہی ہیں کبھی رضی اللہ عنہ کا لفظ نہیں نکلتا بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ امام حسن علیہ السلام امام حسین علیہ السلام کے الفاظ بالکل ہی غیر شعوری طور پر بے اختیارانہ نکل جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ کبھی محسوس بھی نہیں کرتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں حالانکہ ان الفاظ کا استعمال خود ان کے اپنے عقائد و نظریات کے قطعاً خلاف

ہوتا ہے۔ بہرحال یہ وہ غیر شعوری اثرات ہوتے ہیں جن کا اکثر و بیشتر احساس بھی نہیں ہوتا اور وہ اپنا کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کچھ اس نظریۂ امامت کے متعلق ہوا۔ ملت اسلامیہ کی ایک عظیم اکثریت نے بحیثیت ایک عقیدہ کے اس نظریہ کو اگرچہ تسلیم نہیں کیا مگر ان کا تحت الشعور اس سے اتنا متاثر ہوتا چلا گیا کہ وہ عملاً اس سے اسقدر مانوس ہوتے چلے گئے کہ جب ان کے سامنے باپ کے بعد بیٹے گدیوں پر بیٹھنے لگے تو انھوں نے اس پر قطعاً تعرض نہیں کیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج جبکہ ساری دنیا سے ملوکیت ختم ہوتی جا رہی ہے مسلمانوں میں نئے بادشاہوں کی تخت نشینی کے جشن منائے جاتے ہیں۔

بہرحال یہ ہے جو کچھ ہماری تاریخ اس مسئلہ کے متعلق ہمیں بتاتی ہے۔

ہمیں اس پر بالکل اصرار نہیں کہ گذشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ لفظاً لفظاً صحیح ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ غلط ہو کیونکہ بہرحال یہ تمام نتائج تاریخ ہی کے تو ہیں اور تاریخ یقینی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تاریخی نتائج آپ کے جذبات کو مجروح کرتے ہیں اور آپ انھیں تسلیم کرنے کے لئے خود کو آمادہ نہیں پاتے تو اتنی گذارش ہم نہایت ادب کے ساتھ کریں گے کہ اس صورت میں کیا ہماری یہ تاریخ اس قابل نہیں کہ اس کو کہیں دریا برد کر دیا جائے اور ہمیشہ کے لئے اس سے چھٹکارا پا لیا جائے۔ اور اپنے اسلاف میں سے ہر ایک کے متعلق دل میں نیک خیال رکھتے ہوئے ہم اپنے حال اور مستقبل کو خالص قرآن کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں کیونکہ اس کے یقینی ہونے میں قطعاً شک و شبہ نہیں۔

اس مضمون کی آئندہ قسط میں بتایا جائے گا کہ تاریخ کی روشنی میں مسلمانوں میں ملائیت کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی۔

زندہ باد بزمِ طلوعِ اسلام مردان

ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب ترجمان بزم طلوع اسلام مردان نے اطلاع دی ہے کہ مردان کی بزم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ معاونین ادارہ طلوع اسلام کی اسکیم میں اجتماعی حیثیت سے حصہ لے رہی ہے۔ تفصیلات کیلئے آئندہ پرچہ کا انتظار فرمائیے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

پس چہ باید کرد

(از ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب (حیدرآباد دکن)

[حیدرآباد یونیورسٹی کے (سابق) پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب ہند اور پاکستان کے علمی، ثقافتی، آئینی اور سیاسی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہی نے تقسیم سے پہلے ہندوستان کا متبادل دستور مرتب کیا تھا جو طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا اور جس نے دنیائے فکر و سیاست کی توجہات اپنی طرف مبذول کرلی تھیں۔ حال ہی میں ان کی ایک بلند پایہ تصنیف (THE MIND AL-QURAN BUILDS) کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ یعنی "وہ ذہن جسے قرآن مرتب کرنا چاہتا ہے" اس کتاب کے ساتویں باب میں محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کی حیاتِ نو کی صرف ایک شکل ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں جو غیر اسلامی تصورات، روایات، فقہ، تفسیر، تاریخ، کے راستوں سے داخل ہو چکے ہیں انھیں الگ کیا جائے اور دین کو قرآن کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر مسلمانوں نے ایسا کر لیا تو انھیں پھر سے وہ بین الاقوامی (امتِ وسطیٰ) کی پوزیشن مل سکتی ہے جو ان کا صحیح مقام تھا۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوا کہ آج جبکہ دنیا (امریکن بلاک اور روس) کے دو متضاد، متخالف اور متعاصم گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، نوعِ انسانی میں وحدت پیدا کرنے کی صورت کیا ہے اور اس میں قرآن اور مسلمان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب کتاب کے آخری (آٹھویں) باب میں دیا گیا ہے۔ اس باب میں دنیا کی بین الاقوامی سیاست اور مسلمانوں کی پوزیشن کا ایسا کھلا کھلا تجزیہ کیا گیا ہے کہ اس سے عالمگیر بساط سیاست کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس انتشار میں وحدت پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اس باب کی اہمیت کے پیش نظر اس کا آزاد ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

جہاں تک طلوع اسلام کے مسلک کا تعلق ہے وہ قارئین طلوع اسلام سے چھپا ہوا نہیں۔ ہمارے نزدیک (جیسا کہ خود ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے) مغربی جمہوریتوں کی سرمایہ داری اور مارکس کا تصورِ اشتراکیت دونوں قرآن کے خلاف ہیں۔ قرآن اپنا مستقل فلسفۂ زندگی اور نظامِ اقتصادیات رکھتا ہے اور وہی مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے آخری حصہ میں قرآنی نظامِ اقتصادیات پر طائرانہ نگاہ ڈالی ہے، اس کی تفاصیل سے بحث نہیں کی (کیونکہ یہ ان کی کتاب کا موضوع نہیں تھا) آج ضرورت اس کی ہے کہ دنیا کو تفصیلی طور پر بتایا جائے کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اس کا مقصود کیا ہے؟ وہ دنیا میں کس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے؟ اس معاشرہ میں اقتصادی نظام کیسا ہوگا؟ دنیا کیوں اس قسم کا معاشرہ اور نظام مرتب نہیں کر سکتی؟

للہ الحمد کہ محترم پرویز صاحب نے (جنھیں معلوم ہوتا ہے کہ مبدأ فیض نے ہمارے دور میں اسی مقصد کیلئے پیدا کیا ہے) ان تمام سوالات کا جواب اپنی عدیم النظیر تصنیف "قرآنی نظامِ ربوبیت" میں دیا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہ کتاب دنیائے فکر میں ایک انقلاب پیدا کر دے گی۔ والحمد للہ رب العٰلمین۔

بہرحال اب آپ محترم ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا آخری باب ملاحظہ فرمائیے۔ مضمون پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھئے کہ کتاب اواخر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ طلوعِ اسلام]

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے امکانات کیا ہیں؟ اس کی کیا صورت ہے کہ وہ زمانۂ حاضرہ کے رجحانات کو اچھی طرح سے سمجھ کر ان کے ساتھ مطابقت حاصل کر لیں؟ دنیا میں مسلمان کوئی مختصر سی جماعت نہیں۔ یہ مختلف جغرافیائی قومیتوں اور ثقافتی طبقوں پر مشتمل قریب پینتیس چالیس کروڑ نفوس ہوں گے۔ جس سرزمین پر یہ بستے ہیں وہ بحرِ اوقیانوس سے بحر الکاہل تک ایک وسیع و عریض پٹی کی طرح پھیلی ہوئی ہے جس کی لپیٹ میں افریقہ اور ایشیا کے دونوں براعظم آ گئے ہیں۔ اسی میں سے کچھ شاخیں شمال اور جنوب کی طرف نکل گئی ہیں۔ یہ خطہ سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس وقت اینگلو امریکن اور روسی سیاست کی حریفانہ کشاکش کے درمیان بطور حدِ فاصل واقع ہے اور ہر دو اطراف کے متقابل اثرات کی زد میں بھی ہے۔ اس کا کچھ حصہ، بالخصوص وسط ایشیائی علاقہ، پہلے ہی سے روسی اقتدار کے ماتحت ہے لیکن

مسلمانوں کی جغرافیائی پوزیشن

دوسرے اسلامی ممالک (سوائے ترکی کے) ابھی تک غیر جانبدار ہیں۔ ایک طرف ان کی جغرافیائی پوزیشن کی اہمیت کا یہ عالم ہے لیکن دوسری طرف ان کی اقتصادی پستی کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جسے مرفہ الحال کہا جا سکے۔ ان ممالک کے عوام افلاس اور جہالت کی تاریکیوں میں غرق، ازمنۂ وسطیٰ کی سی زندگی گذار رہے ہیں۔ اگر کہیں تجدد یا مغربیت کی جھلک نظر آتی ہے تو اول تو وہ صرف خاص خاص طبقوں تک محدود ہے، اور پھر (بدقسمتی سے) انھیں بھی اس تہذیب کا تاریک پہلو ہی پسند آیا ہے۔ ان مایوس کن حالات میں اگر امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو یہ کہ اب دنیائے اسلام کے لگ بھگ میں ایک سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے جس سے چند نئے انداز کے لیڈروں کی نمود ہوئی ہے۔ یہ لیڈر، متنوع ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کو لئے ہوئے سامنے آئے ہیں۔ ان کے سر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان ممالک کے سیاسی شعور کے لئے صحیح راستے متعین کریں۔

ان ممالک کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے قدرتی وسائل پیداوار کو ترقی دیں اور عوام کے اخلاق سنوارنے اور جہالت اور قدامت پرستی کو دور کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کریں۔ اگر انھوں نے ایسا کر لیا تو یہ ممالک امنِ عالم کے حصول اور قیام کیلئے ایک موثر قوت بن جائیں گے اور اس طرح ان توقعات کو پورا کر سکیں گے جو مجلس اقوامِ متحدہ نے (جس کے ان میں سے بیشتر ممالک رکن ہیں) ان سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ لیکن اس مقصد کا حصول دوسرے ممالک سے فنی اور مالی امداد کے بغیر ناممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی مدد اس طرح حاصل ہو سکے گی کہ مدد دینے والے ممالک اس امداد کی دوڑ سے اپنے سیاسی مفاد کا پتنگ نہ باندھ دیں۔ دوسرے یہ کہ اس امن کی نوعیت کیا ہو گی جس کی مجلس اقوامِ متحدہ آرزومند ہے اور جس کے لئے مسلم اقوام کو مجلس کے دوسرے ارکان سے رابطہ استوار کرنا ہو گا۔

مجلس اقوام متحدہ کا وجود اس منشور کی رُو سے ظہور میں آیا تھا جسے اقوام متحدہ کی کانفرنس اور بین الاقوامی ادارہ نے ۱۹۴۵ء میں سان فرانسسکو کے مقام پر منظور کیا تھا۔ اس منشور کی رُو سے، ان اقوام نے جنھوں نے اس مجلس کی رکنیت قبول کی ہے، یہ عہد و پیمان کیا ہے کہ وہ انسانی حقوق اور آزادی کے بنیادی اصولوں کے تحفظ اور نفاذ کے لئے بلا تفریقِ نسل، زبان اور مذہب، پوری پوری جدوجہد کریں گے۔

انسانی حقوقِ عالمگیر

۱۹۴۸ء میں مجلس کی جنرل اسمبلی نے تیس شقوں پر مشتمل "انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ" منظور کیا تاکہ وہ تمام اقوام و ملل کی حسنِ کارکردگی کے ماپنے کا پیمانہ بن سکے۔ یعنی اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی قوم نے مفادِ عام کے لئے کچھ کیا ہے تو اس کے پرکھنے کا معیار یہ ہوگا کہ اس نے اپنے ہاں عالمگیر حقوقِ انسانیت کو کس حد تک نافذ کیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے اس اعلامیہ میں انسانیت کے بنیادی حقوق ـــــ شہری، سیاسی، اقتصادی، عمرانی، مذہبی اور ثقافتی ـــــ بالتفصیل درج ہیں۔ وہ افراد اور اقوام کو اس کی دعوت دیتی ہے کہ وہ تعلیم و تدریس کے ذریعہ ان حقوق اور انسانی آزادی کی ذمہ داری کا احساس عام کریں اور قومی اور بین الاقوامی دونوں قسم کی اصلاحی تدابیر سے کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی اہمیت کو محسوس کرنے لگ جائیں، اور ان پر مؤثر طریق سے عمل پیرا ہوں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس اعلامیہ کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ "ان تمام حقوق کا مجموعہ ہے جو آج تک دنیا کی اقوام، ممالک یا تہذیب نے انسانوں کو دیئے تھے"۔ اس اعلامیہ کا دو ہرا مقصد ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ فرد میں ان صلاحیتوں کی نمود کر دے جن کی رو سے وہ اپنی طبعی، اخلاقی، علمی، ذہنی اور ملی زندگی میں صحیح آزادی کی زندگی بسر کر سکے۔ اور دوسرے یہ کہ ان افراد کی اس طرح ہمت افزائی کی جائے کہ وہ امن عالم کے قیام میں پورا پورا حصہ لے سکیں۔

مسلمان اور بنیادی حقوق کا اعلامیہ

جہاں تک قرآن کے طالب علم کا تعلق ہے مذکورہ صدر منشور کی تمہید یا مقاصد کا کوئی لفظ یا بنیادی حقوق کے اعلامیہ کی کوئی شق بھی ایسی نہیں جو اس کے لئے غیر مانوس ہو۔ وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی رو سے، انسان کے مقام کو خدا سے نیچے اور ساری کائنات سے اوپر قرار دیتا ہے اور نسل، رنگ اور قبائلی امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسانی کو خدا کا کنبہ بنکر رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی ایسا کنبہ جس کا ہر فرد دوسرے افراد کیلئے راعی (چرواہے) کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ ایسے شخص کیلئے انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ قرآن کے بنیادی پروگرام کا لازمی نتیجہ یا اسی کی ایک بڑھی ہوئی شاخ کے مرادف ہے۔ بایں ہمہ یہ حقیقت ہے کہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے ان حقوق کا اعلان نوعِ انسانی کو اس کے موجودہ مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں لیجا سکتا۔ اسی باب میں قرآنی نقطۂ نظر سے چند اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ وہ کونسا جذبہ ہے جو اقوامِ متحدہ کے منشور یا حقوقِ انسانی کے اعلامیہ کا محرک ہے۔ بالفاظِ دیگر، کیا اس اسکیم کو تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے تصور کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے یا اس سے کسی خاص ملک یا قوم کے مفاد کا تحفظ مقصود ہے؟

دوسرے یہ کہ عالمگیر حقوق کی فہرست کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس وقت دنیائے تہذیب کا کوئی ملک بھی ایسا ہے جسے اس کا دعویٰ ہو کہ وہ ان حقوق پر اس طرح عمل پیرا ہے کہ اس کے ہاں کا معاشرہ دوسروں کے لئے مثال بن سکے؟ یہ ظاہر ہے کہ

ہر ملک کی حکومت یا مجلس قانون ساز ہی ان حقوق کے نفاذ کے لئے قدم اٹھائے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان ممالک کا سیاسی نظام ایسا ہے کہ اس کی رو سے زمام اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہے جن کی نگاہوں میں ان حقوق کا احترام ہو اور جن کے دلوں میں ان کی تنفیذ کی تڑپ؟

اور آخری سوال یہ ہو کہ کیا ان دونوں دستاویزات کے پیش نظر ایک ایسا نظام عالم ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک مشترک مقصد ہو اور وہ مقصد تمام دنیا کے ممالک کے لئے قابل قبول بھی ہو۔ آج دنیا کی جو حالت ہے اس کی رو سے دنیا دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ـــــ ایک طرف روس اور دوسری طرف امریکی کیمپ ـــــ ایک عالمگیر نظام (خواہ اس کی ہیئت کیسی ہی کیوں نہ ہو) اسی وقت ممکن ہوگا جب ان دونوں کیمپوں کے متضاد تصورات زندگی میں مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکے یا کم از کم یہ دونوں کیمپ باہمی تعاون کیلئے کوئی بین بین راہ نکال سکیں۔ کیا موجودہ صورت حالات میں اس قسم کی مفاہمت کا امکان ہے؟

آیئے ذرا ان سوالات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عالمگیر حقوق انسانیت کے اعلامیہ کا محرک کونسا جذبہ یا مقصد ہے؟ یہ حقیقت کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ یہ خیال امریکہ سے ابھرا تھا۔ یہی وہ ملک تھا جو گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سب سے زیادہ طاقتور ملک کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اتنا طاقتور کہ اس کی قوت بہت سی اقوام کی سیاسی پالیسی کو متاثر کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ مذکورہ بالا اعلامیہ درحقیقت ایک بڑے پروگرام کا جزو ہے جس کا مقصد امن عالم کا قیام ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس امن عالم کی نوعیت کیا ہے جس کے حصول کے لئے یہ سارا پروگرام بنایا جا رہا ہے؟ یہ سوال انسان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر اسلئے سامنے آتا ہے کہ دنیا کو اس سے پہلے اس قسم کے بلند آہنگ منصوبوں کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ یہ منصوبے اٹھائے تو گئے ان دعاوی کے ساتھ کہ ان سے مقصود نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے، لیکن آخر الامر ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا میں استعماریت کے شکنجے اور مضبوط ہو گئے۔ لہٰذا موجودہ پروگرام کو دیکھکر اس قسم کے سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ان سوالات کا جواب بھی امریکہ ہی کو دینا ہوگا۔ اسلئے کہ آج دنیا میں امن عالم کا کوئی فارمولا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک وہ امریکہ کی پالیسی کے موافق نہ ہو۔

اس بارہ میں حکومت امریکہ کے محکمۂ خارجہ کے ایک ذمہ دار رکن کا بیان پیش کیا جاتا ہے جو اس نے مذکورہ صدر اعلامیہ کی منظوری کے فوری بعد دیا تھا۔ مسٹر جارج میک گھی، اسسٹنٹ سکرٹری امور خارجہ نے (Young Democratic Club) کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اگر ہم امریکہ کی خارجی پالیسی کے بنیادی مقاصد یعنی اپنے ملی قیام کے تحفظ اور اپنے معاشرہ کی بقاء کا حصول چاہتے ہیں، تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم آزاد اقوام کی امداد جاری رکھیں تاکہ وہ روسی اقتدار کو آگے بڑھنے سے روکتی رہیں۔ ہماری ہر وقت یہ کوشش ہونی چاہئے کہ روس اور امریکہ کی کشمکش محدود ترین حلقہ کے اندر رہے اور ان دونوں میں فوجی تصادم کی نوبت نہ آنے پائے۔
> لیکن یہ مقصد ہمارا قلیل ترین مقصد ہے۔ اتنی سی بات پر نہ تو اقوام عالم ہمارے مفاد کیلئے ایک محاذ پر جمع ہوں گی اور نہ ہی ان

پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے کوئی متحدہ کارروائی کریں گی جو آج آزاد دنیا کو درپیش ہیں ـــــ اس قسم کے مسائل، جیسے نئی نئی آزاد مملکتوں کا قیام تاکہ ان کے باشندے بہتر زندگی بسر کر سکیں۔ یا بعض علاقوں میں اس قسم کا روز افزوں احساس کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں اس نہج سے حصہ نہیں لے رہے جو ان کے مادی ذرائع یا ان کی عظیم روحانی خصوصیتوں کے شایانِ شان ہو ـــــ ـــــ ہمیں ان قومی عناصر کے چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم آزاد اقوام کو پوری پوری امداد دیں تاکہ وہ اپنی تمدنی، اقتصادی اور سیاسی مرفہ الحالی کو آگے بڑھا سکیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جمہوری اقوام خود اپنی تدریجی ترقی اور تحفظ ذات کے جذبہ کے ماتحت ہمارے ساتھ رضا کارانہ تعاون کے لئے تیار ہو سکیں گی۔ اور صرف یہی طریقہ ہے جس سے ہم اجتماعی امن و سلامتی اور بین الاقوامی ربط و تعاون کو حاصل کر سکیں گے جس پر ہماری مستقبل کی خود مختار قومی زندگی کا انحصار ہے۔

امریکی مفاد کا تحفظ

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس بیان میں کس طرح سارا زور امریکہ کی قومی حفاظت اور اس کی معاشرتی زندگی کی صیانت پر دیا گیا ہے؟ اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے ـــــ یعنی دنیا میں نئی نئی آزاد مملکتوں کی نمود، دوسری اقوام کی مالی امداد تاکہ وہ اپنی تمدنی، اقتصادی اور سیاسی مرفہ الحالی کو بڑھا سکیں وغیرہ وغیرہ ـــــ یہ سب ذرائع ہیں مذکورہ بالا ہر دو مقاصد کے حصول کے لئے! اس بیان میں جو دوسری چیز نمایاں طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ امریکہ اس بات کو قطعاً روا نہیں رکھے گا کہ جن اقوام کی وہ امداد کرے وہ غیر جانبدار رہیں۔ وہ ان سے توقع رکھے گا کہ وہ روس کے خلاف رضا کارانہ طور پر امریکی محاذ میں شامل ہوں۔

یہ حقیقت کہ دوسری اقوام کو مدد دینے کے معاملہ میں امریکہ کی پالیسی آج بھی مذکورہ بالا محرکات و مقتضیات ہی کی بنیادوں پر استوار ہے، اس بیان سے بھی واضح ہے جو امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈین ایچیسن نے ۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو دیا تھا جبکہ ایوانِ نمائندگان میں پریذیڈنٹ ٹرومین کا امدادِ باہمی کا پروگرام زیر بحث تھا۔ مسٹر ایچی سن نے ہندوستان کے انتخابات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

> ہمارے وہ نمائندے جو ان انتخابات کے موقع پر خود ہندوستان میں موجود تھے بیک زبان کہتے ہیں کہ اگر نہرو حکومت نے آئندہ پانچ سال میں نمایاں اقتصادی ترقی کا ثبوت نہ دیا تو امکان یہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں جمہوری عناصر کو یا تو دائیں بازو کے متشددین کا سامنا کرنا پڑے گا اور یا کمیونسٹوں کا۔ میں پورے اعتماد اور بھروسہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر نہرو گورنمنٹ اپنے ملک کی اقتصادی ترقی کو نمایاں طور پر اہلِ ملک کے سامنے لے آئی تو وہ کمیونسٹوں کے خلاف جنگ جیت لے گی۔

تحفظِ خویش، انسان کا جبلّی تقاضہ ہے اس لئے امریکہ کی یہ خواہش کہ وہ اپنی قومی صیانت کا تحفظ کرلے، بین الاقوامی مفاد کو ناگوار نہیں گذرنا چاہیئے۔ میں تو یہاں تک بھی کہوں گا کہ اگر امریکہ اپنے اس جذبۂ تحفظِ خویش کے ساتھ ساتھ دوسری اقوام کی مرفہ الحالی کا خیال رکھتا ہے، بالخصوص پسماندہ اقوام کا تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ نے تحفظِ خویش کے جذبہ میں انسانیت کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ امریکہ کے اربابِ حل و عقد کی طرف سے اس قسم کے بیانات جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں، انسان کو

یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ دیگر اقوام عالم کی امداد کے یہ تمام اقدامات درحقیقت روس کے خلاف ایک متحدہ محاذ کے قیام کی کوششیں ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر سوچنا یہ ہوگا کہ کیا ان اقوام کے لئے جو امریکہ کی مختلف امدادی اسکیموں سے فائدہ حاصل کرتی ہیں یا اس کے حصول کے لئے آرزومند ہیں، اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں رہے گا کہ وہ روسی اقتدار کی توسیع کے خلاف نبرد آزما ہیں اور اس مقصد کیلئے امریکہ کے ممد و معاون بنیں کہ وہ دنیا کو دو مسلح محاذوں میں تقسیم کر رکھے؟ ایک محاذ وہ جس کا مقصد امریکہ کی قومی صیانت اور معیار زندگی کا تحفظ ہو اور دوسرا محاذ وہ جو روسی اقتدار کے زیر اثر رہے۔ خدا کرے کہ امریکہ کا فی الحقیقت یہ مقصود نہ ہو۔

اسلام اور کمیونزم اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو زیادہ غور طلب ہے۔ مختلف ممالک میں اپنے اپنے طور پر کمیونزم کی مخالفت مختلف وجوہات سے ہو سکتی ہے ــــ خواہ یہ مخالفت امریکہ کے تعاون کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اس باب میں جن ممالک کو امریکہ کا تعاون حاصل ہو ان کے لئے یہ ناگزیر ہو کہ وہ امریکہ کے سرمایہ دارانہ تصورِ حیات سے بھی ہم آہنگی اختیار کر لیں؟ مثلاً اسلامی ممالک کو لیجئے۔ ان پر ایک طرف سے کمیونزم کا دباؤ پڑ رہا ہے ــــ اور دوسری طرف سے سرمایہ داری کا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی نظام بھی اپنی موجودہ شکل میں قابل قبول نہ ہو۔ ان کی نگاہوں میں یہ دونوں نظام ہائے حیات باطل ہوں، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ان میں سے ایک باطل کا استیصال اسی صورت میں ممکن ہو کہ یہ ممالک دوسرے باطل سے کامل طور پر ہم آہنگ ہو جائیں؟ حال ہی میں اُس کانفرنس کی کارروائی شائع ہوئی ہے جو مارچ ۱۹۵۱ء میں واشنگٹن کے ادارۂ مشرق وسطیٰ (Middle East Institute) کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں "زمانۂ حاضر میں اسلام" کے عنوان پر متعدد خطبات و مقالات پڑھے گئے۔ یہ مقالات ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہوئے ہیں جس کی "تمہید" کے حسب ذیل ٹکڑے سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں۔

> باشندگانِ امریکہ کے لئے دنیائے اسلام کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ یہ اس لئے کہ (علاوہ اس کے کہ اسلامی ممالک کی جغرافیائی پوزیشن کتنی اہم ہے) یہ خطہ جو اپنے اندر بے پناہ امکانی قوتیں رکھتا ہے ابھی تک اس کشمکش میں غیر جاندار ہے جو مغربی جمہوریتوں اور روسی کمیونزم اور اس کے زیر اثر ریاستوں کے درمیان جاری ہے۔ متعدد وجوہات کی بنا پر دنیائے اسلام کا میلان جمہوریتوں کی طرف ہے لیکن اس کے باوجود کچھ زبردست اثرات ایسے بھی ہیں جو نہ صرف ان ممالک کے، جمہوریتوں کے ساتھ کامل توافق کی راہ میں حائل ہیں، بلکہ انھیں فریقِ مخالف کے محاذ کی طرف جھکا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا مکمل حل یہی نہیں کہ ہم ان ممالک کی اقتصادی پستی کو دور کر دیں۔ اس کا حل سوچنے میں ہمیں اس بنیادی تضاد کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو مغربی جمہوریتوں اور دنیائے اسلام کے تصورِ حیات میں ہے۔ مغرب اس باب میں اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو یقین دلا دے کہ جن اقدار کا وہ حامل ہے وہ ایک بہتر زندگی کی دلیل راہ ہیں۔

مغرب کے تقاضے اس سے ظاہر ہے کہ اس "تمہید" کا مصنف اس سے بالکل مطمئن نہیں ہوگا کہ مسلم اقوام اپنے اقتصادی معیار کو بلند کر کے اشتراکیت کی دعوت کو مسترد و مطرود کر دیں۔ مغرب کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ممالک اس کے

ساتھ پوری پوری ہم آہنگی اختیار کرلیں ـــــ اپنی انفرادیت اور تشخص کو قائم رکھتے ہوئے نہیں بلکہ مغربی اقدارِ حیات کے سامنے سجدہ ریز ہوکر۔ اس قسم کی تدابیر کی محرک آرزوئیں کتنی ہی نیک کیوں نہ ہوں، یہ مسلمانوں کی نفسیات اور ان کی روایاتی خصوصیات کو یکسر نظر انداز کرتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس سے کسی ملک کی غربت اور افلاس کا علاج ہوجاتا ہو تو وہ یقیناً کمیونزم کے خلاف محاذ قائم کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ اس حد تک تو مسلمان آسانی سے مغربی ممالک کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر مغربی اقوام یہ سمجھتی ہوں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی اقدارِ حیات سے ہم آہنگ کرلیں گے (یعنی ان اقدارِ حیات سے جو اسلامی تصورِ زندگی سے متضاد ہوں) تو انھیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بہت بڑے فریب میں مبتلا ہیں۔ یہ توحتمی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک جمہوریت اور ان عالمگیر اقدارِ حیات کا تعلق ہے جن کا اظہار "انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ" میں کیا گیا ہے، مسلمان (ان مقاصد کے حصول کے لئے) بڑی جانفشانی سے مصروفِ جدوجہد ہوسکتے ہیں۔ اسلئے کہ جیسا پہلے کہا جاچکا ہے، یہ مقاصد اس دور میں خود اسلام کے بنیادی مقتضیات کے ضمن میں آجاتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ مغرب کے ان اقدارِ حیات کو اپنالیں جو وہاں سے چل کر اس وقت تک مشرق میں پہنچ چکے ہیں۔ مشرق کا ان اقدارِ حیات سے تعارف، مغربی استعماریت اور ملوکیت کی گوناگوں شکلوں کی روسے ہوا ہے اور اس استعماریت و ملوکیت کا جتنا تلخ تجربہ شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کو ہوا ہے دنیا کے کسی دوسرے ملک کو ایسا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔ پروفیسر حتی (Hitti) کے الفاظ میں:-

> بدقسمتی سے گذشتہ دس بیس برس کے عرصے میں مغرب کا مشرق سے ہر رابطہ خوشگوار نہیں رہا۔ ہمارے مشنریوں، معلموں اور مبلغوں کے انسانیت ساز دعاوی، اور فرنگی اور امریکی مدبروں اور فوجیوں کے انسانیت سوز طرزِ عمل میں زمین اور آسمان کا تفاوت کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ قول و فعل کا اسقدر کھلا ہوا تضاد؟ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے ساری اہمیت اپنے قومی اور اقتصادی اقدار ہی کو دی ہے۔ ذرا سوچئے کہ ہماری تمام نہاد ترقی یافتہ اقوام نے گذشتہ دو مہیب جنگوں میں جن کی تباہیوں کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی جو طرہ اختیار کیا۔ جس بیدردی سے انھوں نے بربادی اور سفاکی کی اُن تمام قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیا جو ان کی سائنس اور مشینوں کی پیدا کردہ ہیں۔ اور جن سے دنیا کی عافیت ابھی تک خطرے میں ہے پھر امریکہ، برطانیہ اور فرانس اور دیگر اقوامِ عالم نے جو طرزِ عمل فلسطین کے مسئلہ میں اختیار کیا۔ ان تمام حرکات کے مجموعی اثر نے مشرقِ وسطیٰ کے ان مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں جو اقوامِ مغرب سے ذہنی روابط قائم کرنا چاہتے تھے۔ مغرب کی انہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے رہنے والے ان سے اس طرح اظہارِ بیگانگی کررہے ہیں۔ انہی کی وجہ سے اب ان لوگوں کا مغربی انسان کے کیرکٹر اور ذاتی اور سیاسی دونوں سطحوں پر، اس کے اخلاق پر اعتماد نہیں رہا۔

لہٰذا اگر اہلِ مغرب چاہتے ہیں کہ ان ممالک کے مسلمان جمہوریت اور امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک مؤثر قوت بن جائیں تو اس کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ ان مقاصد کو ان کے اپنے اقدارِ حیات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں ہزار خرابیاں ہوں ـــــ وہ خرابیاں بھی جو ان کی قدامت پرستی کا نتیجہ ہیں اور وہ بھی جو ان میں مغرب کی اندھی تقلید سے

پیدا ہو چکی ہیں ـــــ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ قرآن سے تعلق اور حضور رسالتمآبؐ کی ذات سے وابستگی کے احساسات ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہیں اور کوئی نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات اِن کے ہاں نہ بار پا سکتا ہے اور نہ کامیاب ہو سکتا ہے، جب تک وہ ان کے ان گہرے اور شدید جذبات کی رعایت نہ رکھے۔ اپنی تہذیب و ثقافت کے ان سرچشموں کے ساتھ جذبۂ وفاشعاری ہی وہ بنیاد ہے جس پر ان کی سیاسیات کی عمارت استوار ہوتی ہے اور کوئی قوم انھیں اپنا طرفدار نہیں بنا سکتی جب تک وہ ان کے ہاں اس دروازے سے داخل نہ ہو۔

ترکی اور اسلام کہا جا سکتا ہے کہ ترک بھی تو مسلمان ہی ہیں۔ وہ اس طرح یکسر مغرب پرست کیوں بن گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس مغرب زدگی کا باعث ان کا وہ ذہنی بحران تھا جو بیحد نامساعد حالات کے مجموعی اثرات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں الغائے خلافت کا فیصلہ کیا جو صدیوں سے مسلمانانِ عالم میں کسی نہ کسی رنگ میں رشتۂ وحدت کا موجب بنے چلی آ رہی تھی۔ اسی سال انھوں نے وزارت امور مذہبی کو منسوخ اور شرعی عدالتوں کو بند کر دیا اس کے بعد انھوں نے اپنے ضوابطِ قانون ہرل ڈالے اور دینیات کے مدارس بند کر دیئے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے رومی ٹوپی کو سر سے اتار پھینکا۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اتاترک کا پہلا مجسمہ نصب کیا اور ۱۹۲۸ء میں اپنے دستورِ مملکت سے ان شقوں کو حذف کر دیا جن میں یہ لکھا تھا کہ ترکی کا مملکتی مذہب اسلام ہے۔ اس کے دوسرے سال مذہبی تعلیم کو بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات بند کیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں جبہ و عمامہ کو ممنوع قرار دیا گیا اور ۱۹۳۷ء میں اس کا اعلان کیا گیا کہ ترکی کا آئین غیر مذہبی (SECULAR) ہے۔ اس طرح انھوں نے سرکاری طور پر مذہب سے اپنا تعلق یکسر منقطع کر لیا۔

لیکن کیا اس سے اسلام بھی ترکی سے جلاوطن ہو گیا اور ترکوں نے اس کی ضرورت کو محسوس کرنا چھوڑ دیا؟ جن لوگوں نے ان تبدیلیوں کا سطحی نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ ان ظواہر سے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ لیکن جن نگاہوں نے سطح سے نیچے اتر کر دیکھا ہے انھوں نے محسوس کیا ہے کہ ترکوں کے دل کی گہرائیوں میں مذہب کی محبت اسی طرح تپش آمادہ ہے۔ ترکی کے نئے مدبروں نے اپنے شوقِ تجدد میں چاہا کہ مذہب کو بھی جدید قالب میں ڈھال لیا جائے، لیکن ان کا طریق کار خوش آئند نہیں تھا۔ جہاں تک مملکت کو جمہوری رنگ میں رنگنے کا تعلق تھا ترک عوام اپنے لیڈروں کے ساتھ آخری حد تک جا سکتے تھے۔ (اور وہ درحقیقت آخری حد تک گئے بھی) یہ تحریک انھیں کبھی ناگوار نہیں گذر سکتی تھی کیونکہ یہ اسلامی روایات کے عین مطابق تھی۔ لیکن جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ اپنے لیڈروں کا ساتھ اس حد تک کبھی نہیں دے سکتے تھے جس حد تک وہ (لیڈر) جانا چاہتے تھے۔ اگر تجدید مذہب سے مقصود یہ ہوتا کہ اسلام کو ان زنجیروں سے آزاد کیا جائے جن میں ازمنۂ متوسطہ (کے دورِ استبداد و تقلید) نے اسے جکڑ رکھا تھا اور ان کی بجائے قرآنی اقدار کو نافذ کیا جائے، تو اجتہاد کی اس انقلابی مہم میں ترکی تمام عالمِ اسلام کی قیادت کرتا۔ اس انقلاب عظیم کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلامی ممالک میں مغربی استعماریت اور مفاد پرستیوں کی روک تھام ہو جاتی اور دنیا قرآن کے اس اقتصادی نظام سے روشناس ہو جاتی، جس میں دولت کی فراوانیاں وہ انسانیت سوز چنگاریاں نہیں پیدا کر سکتیں جن سے کمیونزم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔

ترکی کیلئے یہ سب کچھ ممکن تھا جب اس نے ۱۹۲۴ء میں جمہوریت کا اعلان کیا ہے۔ اُسوقت دنیائے اسلام میں اس کی ابھی اتنی ساکھ باقی تھی۔ لیکن اس کے اربابِ بست و کشاد نے ایسا زریں موقع ہاتھ سے کھودیا۔ انھوں نے تجدیدِ مذہب کے شوق میں جس کا بدقسمتی سے، ان میں نہ کوئی ذہنی اعتبار کا اہل تھا نہ قلبی اعتبار سے، مذہب کے ظواہر کو اپنا تختۂ مشق بنایا۔ گویا ان کے نزدیک مذہب نام تھا فقط ان شعائر و رسومات کا جن کے بدلنے سے (انھوں نے سمجھ لیا کہ) اسلام کی تجدید ہوجائیگی۔ چنانچہ اس کے لئے انھوں نے سب سے پہلے نماز کی شکل بدل ڈالی۔ انھوں نے (تجدیدِ مذہب کے لئے) جو کمیٹی ۱۹۳۰ء میں مقرر کی تھی، اسے زیادہ سے زیادہ اگر کچھ سوجھا تو اتنا کہ نماز ترکی زبان میں پڑھی جائے اور اس کے لئے (زبانی پڑھنے کی بجائے) لکھے ہوئے کاغذ سامنے رکھ لئے جائیں۔ قدیم اور جدید دونوں قسم کی موسیقی، صوتی اور مزامیری، رائج کی جائے۔ تبلیغی مشن۔ جدید طرز کے منبر۔ لباس کے کمرے اور صاف جوتوں سمیت مسجد میں آنے کی اجازت وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھیں اس کمیٹی کی سفارشات۔ لیکن اس کمیٹی کو جلد ہی توڑ دینا پڑا۔ اسلئے کہ ترکوں کو منہاجِ نبوت کے ساتھ جو قلبی تعلق تھا اس کی وجہ سے وہ اس قسم کی بدعتوں کو کبھی پسند نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی اس جدید راستے پر گامزن ہوسکتے تھے۔ اس کمیٹی کی برطرفی درحقیقت پیش خیمہ تھی (تجدد مذہب کے خلاف) اُس ردِ عمل کا جو وہاں اب پورے طور پر نمودار ہوچکا ہے۔ اس باب میں جون کنگسلے برج[1] لکھتا ہے۔

> گذشتہ چند سالوں میں ترکوں کا رجحان بالکل سمتِ مخالف کی طرف ہوگیا ہے۔ حال ہی میں قدامت پرست رہنماؤں کے مطالبات کے پیشِ نظر کچھ مذہبی مراعات دی گئی ہیں۔ سب سے پہلی رعایت محدود شکل میں مذہبی تعلیم کا اجراء ہے۔ شروع میں خیال یہ تھا کہ چوتھے اور پانچویں درجے میں مذہبی تعلیم کو اختیاری قرار دیدیا جائے اور اس میں صرف وہی طالب علم شریک ہوسکیں جو اپنے والدین سے اجازت نامہ لائیں۔ یہ تعلیم، مدرسے کے اوقات کے بعد دی جائے (اربابِ حل و عقد کا منشا یہ تھا کہ اس طریقِ کار میں) ایسی احتیاط برتی جائے کہ مذہبی تعلیم پھر سے اس قدامت پرست طبقہ کے ہاتھ میں نہ جانے پائے جو جمہوریت کی اصلاحات کے بجائے قدیم شرعی قوانین کو از سرِ نو رائج کردے۔ اس سال سے مذہبی تعلیم کو جبری قرار دیدیا گیا ہے اور جو والدین اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم سے الگ رکھنا چاہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کیلئے اجازت حاصل کریں۔
>
> دوسری رعایت یہ دی گئی ہے کہ جامعہ انقرہ میں دینیات کا شعبہ کھول دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شعبہ جدید سائنٹفک انداز کا ہوگا۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہوگا کہ طالب علموں کو مختلف مذاہب کا متقابل مطالعہ کرایا جائے اور (مذہبی کتابوں کے) متن اور اسناد پر تنقید کی اجازت دی جائے۔ اگر یہ کچھ اسی طرح ہوا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس شعبۂ دینیات کو اُسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو معتدل عیسائیوں کے علمبرداروں کو پچھلی صدی میں پیش آئی تھیں؟

---

[1] M. John Kingsley Birge, Director publications Department American Bureau of Commissioner For Foreign Missions Istambol.

اس کے بعد مسٹر کنگسلے لکھتا ہے :-

گذشتہ سال تک اگرچہ قانوناً ضروری تھا کہ اذان ترکی زبان میں دی جائے لیکن اس پر عمل درآمد کبھی نہ ہو سکا۔ اب اذان عربی ہی میں دی جاتی ہے۔ مجھے ابھی تک کوئی ترک ایسا نہیں ملا جو قرآن کو ترکی زبان میں پڑھنا پسند کرتا ہو۔ قرآن ابھی تک عربی ہی میں پڑھا جاتا ہے۔ بغیر ترجمہ یا تفسیر کے قرآن کے عربی الفاظ دہرائے جاتے ہیں جن کا مطلب کوئی ترک نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کے یہ عربی الفاظ ان کے دلوں میں گرم جوشی پیدا کر دیتے ہیں۔

میں نے ترکی کی مثال یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے کہ جس ملک کے مدبرین نے پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ انھیں یکسر مذہب کے رنگ میں رنگے جانا چاہئے، وہاں کے عوام بھی اس پر آمادہ نہ ہو سکے کہ وہ اپنی ثقافتی روایات کو نگاہوں سے اوجھل ہو جانے دیں۔ اس وقت صورتِ حالات یہ ہے کہ قریب قریب ہر اسلامی ملک کے اربابِ فکر و نظر سوچ رہے ہیں کہ وہ مذہبی قدامت پرستی کو برضا و رغبت خیرباد کہدیں اور اپنی تمدنی فکر کو قرآنی

اسلام کی صحیح تجدید

بنیادوں پر از سرِ نو تشکیل کر لیں تاکہ اس سے دورِ حاضر کے پیچیدہ تقاضے پورے ہو سکیں۔ اگر انھوں نے اپنی اس کوشش میں اتنی جرأت سے کام لیا کہ وہ مروجہ مذہبی عقائد و تصورات کے متن اور تاریخی اسناد کو تنقیدی نگاہ سے پرکھ کر دیکھ لیں (کہ ان میں سے کون کون سا اسلام کے اصل سرچشمہ کے مطابق ہے اور کونسا بعد کا وضع کردہ) جس طرح (مسٹر کنگسلے کے خیال کے مطابق) انقرہ کے شعبۂ دینیات کو کرنا ہوگا، تو اس سے اسلام کو بیش بہا فائدہ پہنچے گا۔ اگر (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کا مشورہ دیا ہے) یہ کام مسلمانانِ عالم کی باہمی مشاورت سے اجتماعی انداز میں کیا گیا تو اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے ایک مشترکہ ضابطہ و فقہ مرتب ہو جائے اور اس "جدید شریعت" کی طرف خود ترکی بھی پلٹ آئے۔ اگر کہیں ایک مرتبہ بھی ایسا ہو گیا کہ (ہمارے مذہبی ذخائر میں سے) سونا اور کھوٹ الگ الگ ہو جائیں (یعنی قرآن کا حقیقی اسلام) بعد کے وضع کردہ عجمی اسلام سے نتھر کر الگ ہو جائے) اور اس طرح مسلمان کا رشتہ پھر سے اس کے اصل سرچشمۂ حیات سے جڑ گیا تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دنیا بلا توقف و تامل مغربی جمہوریت کی ہر وہ چیز قبول کر لے گی جو قرآن کے مطابق ہوگی اور اس کے بدلے میں مغرب کو وہ کچھ دے سکے گی جس سے وہ اس وقت تک محروم ہے اور جس سے اس کے تصوراتِ جمہوریت اور اقتصادی نظریات مستقل اقدارِ حیات کی ہم آہنگی سے مادی چار دیواری سے ابھر کر آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچیں گے۔ اگر امریکہ چاہتا ہے کہ کمیونزم اسلامی ممالک میں نہ پھیلے تو وہ آئے اور مسلمانوں کے اقتصادی معیار کو بلند کرنے میں نہایت نیک نیتی سے ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن اس سے آگے ان کے معاملات میں قطعاً دخل نہ دے۔ اس لئے کہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا کہ مسلمان مغربی اقدارِ حیات کو بھی اپنا لیں، نہ صرف دشوار گذار راستہ ہے بلکہ آخر الامر سخت نقصان کا موجب بھی۔ راہِ صواب صرف یہ ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کو ان ہمہ گیر اقدار کی طرف مائل کیا جائے جو "انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ" میں درج ہیں اور جنھیں قبول کرنے کا وہ پہلے ہی اقرار کر چکی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کا طریقہ یہ نہیں کہ اپنے حریفِ مقابل (روس) کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی اسکیمیں بناتے چلے جائیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کی جائے۔ کامیابی کی راہ تطہیرِ ذات کے سوا اور کوئی نہیں۔

عملاً کچھ نہیں ہوا

چھ سال کا عرصہ ہو گیا جب "اقوام متحدہ کے منشور" پر دستخط ہوئے تھے اور تین سال ہونے کو آئے جب اقوام عالم نے "انسانی حقوق کے اعلامیہ" کی تائید کی تھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں ان دستاویزات کی دفعات کو عملاً نافذ کرنے اور ابن آدم کو طبعی، اخلاقی اور ذہنی آزادی سے ہمکنار کرنے کے سلسلے میں کوئی نمایاں قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس دوران میں ایک کمیشن ضرور متعین کیا گیا تھا کہ وہ "انسانی حقوق" کی ترویج و تنفیذ کے لئے اسباب و ذرائع پر غور کرے۔ لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر کمیشن کی مساعی ابھی تک بارآور نہیں ہو سکیں۔ اس جمود کے لئے کہیں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ کوریا کی جنگ اور جنوب مشرقی علاقوں میں عساکری نقل و حرکت ان "حقوق" کے عام ہونے کی راہ میں حائل ہو گئیں اور کہیں اس کا ذمہ دار مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے مسائل کو قرار دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے بین الاقوامی کشاکش زیادہ تیز ہو گئی۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ مختلف ممالک نے اپنے اپنے ہاں جو حفاظتی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں ان کی وجہ سے انسانی آزادی کے عام ہونے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن اس کا اصل سبب ان بیان کردہ وجوہات سے کہیں گہرا ہے۔ (M. RENE CASSIN) کے الفاظ میں سنئے جو اقوام متحدہ کے "انسانی حقوق" کے اس کمیشن کے نائب صدر تھے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

> سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس "اعلامیہ" میں جو حقوق اور آزادیاں درج ہیں انھیں قانونی حیثیت دی جائے تاکہ ان کی تعمیل سب پر قانوناً واجب ہو جائے۔ دوسرا مرحلہ اس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کونسا ادارہ ہوگا جو اس بات کی نگرانی کرے گا کہ کس ملک نے ان حقوق کی عملی تنفیذ میں کس قدر ترقی کی ہے، نیز جو ان شکایات کو سننے کا مجاز ہوگا جو ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف اس بارے میں کرے کہ اس نے ان حقوق کی اس طرح خلاف ورزی کی ہے۔ تیسری دشواری یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی کمیٹی مقرر کی جائے جو ان حقوق کے خلاف ورزی کے مقدمات کی اپیلیں سن سکتے تو اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ اپیل کا حق کس کس کو حاصل ہوگا۔ یعنی کیا صرف ان مملکتوں کو اپیل کا حق ہوگا جنھوں نے ان "حقوق" کو تسلیم کر لیا ہے یا افراد کو (ان کی حکومتوں کے خلاف) بھی حق مرافعہ حاصل ہوگا۔ نیز غیر حکومتی اداروں کو بھی؟ اس نقطہ کی اہمیت کا اندازہ بآسانی لگ سکتا ہے۔ اس کمیٹی کے سامنے دو سوال ہوں گے۔ یعنی یا تو مروجہ پامال طریقے علیٰ حالہ رہنے دیئے جائیں (جن کی رُو سے کسی فرد کو حق حاصل نہیں کہ اپنی حکومت کے خلاف کسی خارجی عدالت میں اپیل کر سکے) یا پھر عدالتی ضوابط میں اس قسم کی انقلابی تبدیلیاں کی جائیں کہ جہاں کسی مملکت کی رعایا کا کوئی فرد سمجھے کہ اس کا کوئی حق تلف کیا گیا ہے وہ اپنی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف کسی بین الاقوامی ادارہ میں اپیل کر سکے۔

صحیح راستہ

مجلسِ اقوام متحدہ کے سامنے آج یہ اور اسی نہج کی دوسری مشکلات ہیں۔ ان کا حل کس حد تک ممکن ہے؟ صرف اس حد تک جس تک مختلف آزاد، خود مختار مملکتیں نوعِ انسانی کے حقوق کی عالمگیر ترقی کی خاطر اپنی "خود مختاری" سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہوں تاکہ اس سے ایک محکم نظامِ عالم قائم ہو سکے۔ یعنی قرآنی تصور کے مطابق یہ مملکتیں اپنی "ارضی" خود مختاری کو اس خدا کے حوالے کر دیں جسے فرمانروائی کا حقیقی حق حاصل ہے اور خود ایک ایسی برادری کی

طرح مل جُل کر رہیں جس میں ہر فرد دوسرے کے حقوق کا نگہبان (راعی۔ چرواہا) ہو۔ اُن مفاد پرستیوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو آجکل دنیا کی جمہوری حکومتوں کا مطمح نگاہ ہیں اور ان انسانوں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے جو ان مملکتوں میں انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آجاتے ہیں، یہ کہنا آسان نہیں کہ ان حکومتوں کی طرف سے اس سوال کا صحیح جواب بروقت مل سکے گا۔ (اور وہ نوعِ انسانی کے منادی کی خاطر اپنی اپنی فرمانروائی پر خود ہی پابندیاں عائد کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی)۔

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں اس مشکل کا حل کیا ہے؟

کرنے کا کام

جب تک اینگلو امریکی بلاک کے سر پر یہ ہوّا سوار ہے کہ کمیونزم دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ یا وہ بلاک اس پالیسی کو اپنے لئے مفید سمجھتا ہے کہ اشتراکی بھوت کے بھیانک تصور کو زندہ رکھنا چاہئے۔ اور وہ اپنی تمام قوتوں کو اس مقصد کے لئے وقف کئے ہے کہ زیادہ سے زیادہ قوموں کو جمع کیا جائے تاکہ روس کے خلاف جنگ لڑی جائے۔ ان دونوں محاذوں کا تصادم روز بروز شدید ہوتا جائے گا اور نوعِ انسانی ایک دوسرے کے خلاف شمشیر بکف رہے گی۔ اگر اس بلاک کا مقصد یہ ہے کہ ایک عام انسان کو کس طرح کمیونزم کے اثر سے دور رکھا جائے تو اس کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس (انسان) کے سامنے اس نسخے کا نعم البدل پیش کیا جائے جسے روس اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور جس میں اسے اپنے افلاس اور مصائب کا علاج دکھائی دیتا ہے کمیونزم کا سیلاب صرف اس طریق سے رک سکے گا۔ ایک عام انسان کی یہ خواہش تو ہوتی نہیں کہ اسے رولز رائس (موٹر کار) ملنی چاہئے اگر اسے اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی میسر ہوتی رہیں تو وہ اس کا خیال تک بھی نہیں کرے گا کہ دوسروں کو اس قدر فراواں سامانِ زیست کیوں مل رہا ہے۔ یہ بنیادی ضروریاتِ زندگی بہرکیف "خدا کی زمین" بہم پہنچا دیگی بشرطیکہ وہ حکومتیں جنھوں نے "حقوق انسانی کے اعلامیہ" پر دستخط کئے ہیں، ایک دوسرے کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں اور نیک نیتی سے ان ضروریات زندگی کی بہم رسانی کا تہیہ کرلیں۔ اگر یہ نام نہاد "آزاد دنیا" زندگی کو اس طرح نئے سانچوں میں ڈھال لے کہ اس میں ایک عام انسان کیلئے دلکشی پیدا ہو جائے تو اس عملی مثال کی قوت سے وہ نہ صرف آزاد دنیا میں کمیونزم کی توسیع کو روک دیگی بلکہ خود کمیونسٹ خطہ کے انسان کو ایک ایسی زندگی کی طرف مائل کرلے گی جس سے وہ کمیونزم کے اندر محروم ہے۔

کمیونزم کا مسئلہ درحقیقت بھوک کا مسئلہ ہے۔ بھوک اور احتیاج کا مارا ہوا انسان ہر اس چیز کو گوارا کرلیتا ہے جو اسے ان بلاؤں سے فوری نجات دیدے۔ لیکن جونہی بھوک کی تسکین ہوئی اور طبعی ضروریات کا دباؤ کم ہوا، انسانی فطرت، جس کی نشوونما کا انحصار

روٹی کے بعد

صرف روٹی پر نہیں، اپنی تسکین کے لئے کسی اور چیز کی طالب ہو جائے گی۔ یہ "اور چیز" لامحالہ روحانی قسم کی ہوگی۔ فطرتِ انسانی کو اس کی طلب ہوگی اور ضرور ہوگی۔ آزاد دنیا کے لئے وہ وقت ایسا ہوگا کہ وہ (ان انسانوں سے ٹوٹے ہوئے) قدیم تعلقات کے رشتوں کی تجدید کرے اور انھیں محکم بنیادوں پر استوار کرلے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس دوران میں وہ خود اپنی زندگی کو نئے قالب میں ڈھال لے۔ اور اپنی مادی ضروریات اور زندگی کے بلند تقاضوں میں توازن قائم کرلے اور اس نئے قالب کو کمیونسٹ دنیا کے سامنے بطور مثال پیش کرے تاکہ وہ بھی اس کی تقلید کرنے لگے۔ یہ ہے دنیا میں وحدت

قائم کرنے کا صحیح طریقہ۔ احاطہ بندیوں سے دنیا میں کبھی وحدت قائم نہ ہو سکے گی۔ یہ یقینی امر ہے کہ روس ایک نہ ایک دن اپنی مادّی ضروریات کی بڑھتی ہوئی پیاس سے تنگ آکر روح کے تقاضوں کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی اس رجعت الی اللہ کا انداز کیا ہوگا۔ اس کے متعلق حتمی طور پر صرف مستقبل ہی بتا سکے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے روس کی صلابت میں نرمی آتی جا رہی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ روس کی مرکزی حکومت نے مشرقی علاقوں کے مسلمانوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ کمیونزم کے اقتصادی نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہب پر کاربند رہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روس کی سرکاری پالیسی کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو، وہاں اب بھی ایسے مرد اور عورتیں موجود ہیں جن کے دل کی گہرائیوں میں خدا موجود ہے۔ اس کی مثال خود

روس میں خدا

اسٹالین کی زندگی کے ایک واقعہ سے پیش کی جا سکتی ہے جس کا ذکر چرچل نے اپنی توزک کی چوتھی جلد میں کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ چرچل ماسکو میں اسٹالین سے اتحادی فوجی کارروائی کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ چرچل لکھتا ہے کہ اسٹالین اس اسکیم سے اسدرجہ متاثر ہوا کہ وہ اس کی تفصیلات کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا اور جب اُس کی جاذبیت انتہائی نقطہ پر پہنچی تو وہ بے اختیار پکار اٹھا "خدا اس اسکیم کو کامیاب کرے"۔

یہ واقعہ اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ عوام تو ایک طرف، خدا کا تصور اسٹالین تک کے دل کی گہرائیوں سے بھی نہیں نکل سکا۔ لہٰذا یہ توقع رکھنا نری خوش فہمی نہیں ہوگی کہ موجودہ روس کا کمیونسٹ ایک نہ ایک دن زندگی کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی حالت کا از سر نو جائزہ لے گا اور اپنے اسلوب کے مطابق، باقی دنیا کے ساتھ دوش بدوش چل پڑے گا بشرطیکہ وہ لوگ جو آج اپنے مفاد کی خاطر دنیا سے کمیونزم کو ملیامیٹ کرنے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں کمیونزم کے اصولوں کی روشنی میں خود اپنی پوزیشن پر نظرثانی کریں اور اپنے اندر مناسب تبدیلیاں پیدا کر کے روسی کمیونسٹ سے مصافحہ کا ہاتھ بڑھائیں۔ اس قسم کی باہمی مفاہمت میں پیشقدمی کرنے کے لئے اسٹالین کی اس تجویز پر کشادہ نگہی سے غور کرنا چاہئے جس میں اس نے کہا ہے[1] کہ ہمیں دنیا میں اس طرح رہنا چاہئے کہ خود بھی زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دیں۔ اس مفاہمت سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ہوگا کہ دنیا کو کچھ وقت کے لئے امن نصیب ہو جائے گا اور متخاصم عناصر کو اس کا موقعہ مل جائے گا کہ وہ اپنی اپنی حالت کا جائزہ لیں اور اصلاحِ ذات پر غور کریں۔ اسٹالین کی مذکورہ صدر تجویز یوں سامنے آئی تھی کہ چند امریکی اخبار اور ریڈیو ایڈیٹروں نے اس سے پوچھا کہ وہ بنیاد کونسی ہے جس سے سرمایہ داری نظام اور کمیونزم دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں اسٹالین نے کہا کہ

> اس کا امکان ہے کہ نظام سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں پرامن طریقہ سے ساتھ ساتھ رہ سکیں بشرطیکہ دونوں گروہوں کے دل میں تعاون کی خواہش ہو۔ وہ دونوں عہد و پیمان کی پابندی پر آمادگی ظاہر کریں اور اس کے لئے تیار ہوں کہ تمام مملکتوں کو مساوی حیثیت دی جائے اور کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔

---

[1] یہ کتاب اسوقت لکھی گئی تھی جب ہنوز اسٹالین زندہ تھا۔ طلوع اسلام

اس میں شبہ نہیں کہ اس تجویز سے بدیہی مقصود تو اتنا ہی تھا کہ دونوں گروہوں میں جو تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس میں کچھ وقت کے لئے کمی واقع ہو جائے۔ لیکن اس کا بھی تو امکان ہے کہ اس عارضی مفاہمت کو بلند مقاصد کا ذریعہ بنا لیا جائے اور دونوں گروہ اپنے اپنے سیاسی نظریات کی اس طرح تشکیل نو کریں کہ ان میں مستقل مفاہمت کی شکل پیدا ہو جائے۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کمیونزم درحقیقت اس سرمایہ داری نظام کے خلاف صدائے احتجاج ہے جسے مغرب کی صنعت گری نے پیدا کیا ہے۔ اگر سرمایہ داری نظام والے ممالک واقعی چاہتے ہیں کہ وہ سبب دور ہو جائے جس کی بنیاد پر کمیونزم نے یہ صدائے احتجاج بلند کی ہے تو ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ انھیں اپنے اقتصادی نظام میں اس انداز کی تبدیلی کرنی ہوگی کہ جس سے دونوں گروہوں کے عوام مطمئن ہو جائیں۔ ورنہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ وہ طریق عمل جس سے کمیونزم

اگر آج مفاہمت نہ ہوئی تو؟

آج زندگی کے خطوط کو متعین کر رہی ہے کیسا ہی متشدد، اور وہ راستہ دور حاضر کے کمیونسٹ کے لئے کتنا ہی دشوار گذار اور صعوبت انگیز کیوں نہ ہو آنے والی نسلیں، جن کے سامنے صرف کمیونزم کے ثمرات و برکات ہی ہوں گے، اس طرز زندگی پر اسقدر محکم یقین رکھیں گی کہ کوئی چیز ان کے اس محکم ایمان کو متزلزل نہیں کر سکے گی مثلاً اشتمالی کاشت کاری کے بارہ میں خود چرچل نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا سماں آ رہا ہے جس میں لاکھوں مرد اور عورتیں یا تو صفحۂ ہستی سے مٹائے جا رہے تھے یا معاشرہ میں ان کا کوئی مقام باقی نہیں رہا تھا۔ یہ سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اور میں اس کے تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کئے جا رہا ہوں۔ لیکن اس کے بعد وہ نسل آئے گی جو ان صعوبات اور مصائب سے بالکل ناآشنا ہوگی، لیکن اس کے ہاں رزق کی فراوانی ہوگی اور وہ اسٹالین کو دعائیں دینگے۔ مجھے برک کا یہ قول یاد ہے کہ ــــ "اگر ظلم کے بغیر اصلاحات حاصل نہیں ہو سکتیں تو میں ایسی اصلاحات سے باز آیا" ــــ (یہ اخلاقی اصول بڑا خوش آئند ہے لیکن) آج جبکہ ہمارے چاروں طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اس قسم کے اخلاقی وعظ لاحاصل ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن آنے والی نسلوں کے نزدیک کمیونزم کا طرز زندگی بالکل فطری ہوگا اور وہ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کا تہیہ کئے بیٹھے ہوں گے، سرمایہ دار جمہوریتوں کے لئے ان کا مقابلہ کس طرح سے ممکن ہوگا؟ ابھی تو کمیونزم اپنے تجرباتی مراحل میں سے گذر رہی ہے، اس لئے اگر اس وقت کوئی ایسا خوشگوار نعم البدل پیدا کر لیا جائے جو کمیونزم اور سرمایہ داری نظام کے درمیان مفاہمت کرا سکے اور جو روئے زمین کے عام انسانوں کے لئے قابل قبول ہو، تو یہ نظریہ، کمیونزم کی جگہ لے سکتا ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو دور حاضر کی جمہوریتوں کے لیڈر اپنے آنے والے بچوں کے لئے مصائب و نوائب کا اتنا بڑا انبار چھوڑ جائیں گے جن پر قابو پانا ان بیچاروں کے بس کی بات نہ ہوگی۔

یہ حقیقت کہ روسی کمیونزم میں تبدیلی کا امکان ہے اس تجربہ سے بھی ظاہر ہے جو چین میں کیا جا رہا ہے۔ یعنی اس چین میں جو یقیناً روس کی طرف جھک چکا ہے۔ اس باب میں (ALAN WINNINGTON) رقمطراز ہے۔

آزاد چین میں تمام بنیادی اور اہم صنعتیں سرکاری ہیں، لیکن پرائیویٹ سرمایہ کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ایسے سرمایہ داروں کی امداد بھی کی جاتی ہے اور سرپرستی بھی تاکہ وہ ثانوی صنعتوں کو ترقی دیں اور روزمرہ کی کھپت کی چیزیں تیار کریں۔ وہاں مزدوروں کے اداروں اور کارخانوں کے مالکوں کے درمیان کاروباری شرائط طے کی جاتی ہیں اور ان بنیادوں کا تعین کیا جاتا ہے جو مزدور اور سرمایہ دار دونوں کے لئے نفع بخش ہوں۔ چنانچہ وہاں آپ کسی مزدور کو دیکھئے خواہ وہ کسی سرکاری کارخانے میں ملازم ہو یا پرائیویٹ ادارہ میں، وہ آپ کو خوش و خرم نظر آئے گا اور پوچھنے پر بتائے گا کہ اب اس کے حالات کیسے اچھے ہیں اور وہ صنعتی ترقی کے لئے ذاتی طور پر کیا کچھ کر رہا ہے (ان کے ساتھ ہی) مجھے وہاں کے کئی سرمایہ داروں نے بھی بتایا کہ وہ جسقدر اب خوش حال ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے اور وہ حسب استطاعت اپنا سارے کا سارا سرمایہ صنعت میں لگا رہے ہیں۔

جب روسی تصور زندگی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہاں کے اقتصادی نظام میں اس قسم کی تبدیلی ممکن ہے تو اس کا امکان کیوں نہیں کہ کمیونزم تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ اسی کیپٹل ازم کے دوش بدوش چل سکے گی جس میں اب خود اشتراکی رنگ کی آمیزش ہو رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں مخالف گروہوں کے لیڈروں کو ایک جگہ جمع کرے تاکہ وہ باہمی تعاون کے ذریعے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے کی تدابیر پیدا کریں۔ جہانتک روس کا تعلق ہے اس امر کے باور کرنے کی کئی وجوہات موجود ہیں کہ وہ موجودہ کشمکش سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے کا خواہشمند ہے۔ اگر اس کا یہ جذبہ صادق ہے اور اس کے لئے اِدھر سے بھی ہاتھ بڑھایا گیا تو یہی چیز دونوں گروہوں میں ایک ایسی امتزاجی کیفیت پیدا کر سکتی ہے جو آخرالامر دنیا کی وحدت کا موجب بن جائے۔

اس چیز کا فیصلہ تو مستقبل ہی کر سکتا ہے کہ یہ آرزو مثمر مندۂ عمل بھی ہوگی یا نہیں، لیکن اگر حالات کا رخ کبھی بھی اس سمت کو پھرا تو اس امتزاج کے لئے اسلامی ممالک کارنمایاں کر سکیں گے بشرطیکہ وہ قرآن کے ان اقتصادی نظریات کی طرف لوٹ آئیں جنھیں

قرآن کیا کچھ کر سکتا ہے؟

انھوں نے اس وقت اس طرح پس پشت ڈال رکھا ہے اس لئے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں قرآن کے ان نظریات نے اس زمانے کی متخاصم اقتصادی قوتوں کے درمیان امتزاج پیدا کر دیا تھا۔ یہ متخاصم قوتیں وہی تھیں جنھوں نے آج کیپٹل ازم اور کمیونزم کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اگر ہمارے اسلامی ممالک نے اور کچھ نہ بھی کیا تو کم از کم وہ اتنا تو ضرور کر سکیں گے کہ ان دونوں مخالف گروہوں (روس اور جمہوری ممالک) میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بن جائیں، جیسا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گبؔ (GIBB) کا خیال ہے جس نے اسلام کے مطالعہ میں ایک عمر صرف کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> اسلام آج بھی مغربی دنیا کی متشدد قوتوں میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ اسلام، مغربی نیشنل ازم کی فوضویت اور روسی کمیونزم کی جکڑبندی، دونوں کا مخالف ہے۔ اور۔ ابھی تک اس اقتصادی ہوّے سے مغلوب نہیں ہوا جو آج یورپ اور روس دونوں کے اعصاب پر بری طرح سوار ہے۔ پروفیسر (MASSIGNON) نے اسلام کے عمرانی اخلاقیات کو ان جامع الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے "اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر فرد معاشرہ سے مساویانہ حیثیت سے

مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قومی محاصل کی تعمیر میں امکان بھر حصہ لے۔ یہ غیر محدود تبادلے، بنک کے سرمائے، مملکت کے قرضے، اور بنیادی ضروریات کی اشیاء پر بالواسطہ ٹیکس کے خلاف ہے لیکن اس کے باوجود یہ والدین اور خاوند کے حقوق، ذاتی ملکیت اور تجارتی سرمایہ داری کا حامی ہے۔ اس باب میں بھی اسلام، مغربی سرمایہ داری اور روس کی کمیونزم کے درمیان، وسطی کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کا اقتصادی نظام

اسلامی اخلاقیاتِ عمرانی کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ تمام نوعِ انسانی امت واحدہ ہے۔ یعنی رسولؐ اللہ کے ارشاد کے مطابق تمام انسان عیال اللہ ہیں جس میں ہر فرد دوسرے کا راعی یا نگہبان ہے۔ اس تصور کے ماتحت ہر قسم کا سلب و نہب ناجائز قرار پاجاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر نوع انسانی کی اقتصادی زندگی کی وہ عمارت استوار ہوتی ہے جو قرآن کی مقصود و مطلوب ہے۔

قرآنی نظام کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ اسلام کے نزدیک پیداوار اور تقسیم کا کوئی نقشہ جائز نہیں قرار پاسکتا جب تک وہ اس بنیادی تصور سے مطابقت نہ رکھے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تمام منفعت بخش اشیاء کو زمین سے حاصل کرے لیکن شرط یہ ہے کہ تمام پیداوار کو یک جا جمع کرکے اس طرح تقسیم کیا جائے کہ اس سے تمام نوع انسانی کی ضروریات پوری ہوجائیں۔ یعنی اس پیداوار سے صرف وہی لوگ استفادہ نہ کریں جنھوں نے اس کے حصول کے لئے محنت کی ہے۔ اس سے وہ بھی فائدہ حاصل کریں جو کسی نہ کسی وجہ سے محنت اور مشقت سے معذور ہوچکے ہوں۔ تقسیم پیداوار کی یہ شرط اسلام کے اس تصور کے اندر مضمر ہے جس کی رو سے تمام نوعِ انسانی کو ایک کنبہ قرار دیا گیا ہے۔

غریبوں کا مسئلہ یعنی ان لوگوں کا مسئلہ جو کبرسنی، بیماری، یا کسی اور ایسے ہی سبب سے روزی کمانے کے قابل نہ رہیں، انسانی معاشرہ کا قدیم ترین مسئلہ ہے۔ اسلام سے پہلے اس مسئلہ کا زیادہ سے زیادہ حل یہ سوچا گیا کہ ایسے لوگ امیروں کی خیرات پر گذارہ کریں۔ لیکن اسلام اس قسم کے بیکس و بے بس انسانوں کو گداگری کے ٹکڑوں پر کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ ملت کی دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے۔ قرآن بار بار اعلان کرتا ہے کہ جو کچھ زمین سے حاصل کیا جاتا ہے وہ صرف انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں خدا کا ہاتھ بھی شامل ہوتا ہے۔ فطرت کی تمام قوتیں جنھیں انسان اپنے کام میں لاتا ہے خدا کے تعاون کی زندہ شہادتیں ہیں۔ اس اعتبار سے خدا انسان کا شریک کار ہوجاتا ہے۔ بلکہ شریکِ غالب۔ قرآن کہتا ہے کہ "اے جماعتِ مومنین اگر تم نے خدا کی مدد کی تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں دنیا میں ثبات عطا کردے گا۔" جب خدا انسان کا رفیقِ کار ٹھہرا تو ظاہر ہے کہ ہر پیداوار میں خدا کا حصہ بھی ہوگا خدا اپنے حصہ کو ان لوگوں کے لئے وقف کردیتا ہے جو اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہ ہوں ـــــ یتامیٰ، بیوائیں، محتاج، مساکین، نادار مسافر اور وہ لوگ جو ہنگامی حوادث کی وجہ سے حصول رزق سے محروم ہوچکے ہوں، یا وہ جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں، اور ایسے مقروض جو ادائیگی قرض کی وسعت نہ رکھتے ہوں۔ قرآن ان سب کو خدا کی کفالت میں دیتا ہے اس لئے کہ یہ خدا کی ذمہ داری ہے کہ جسے اس نے پیدا کیا ہے اسے رزق بھی پہنچائے۔ اس لئے قرآن ان لوگوں کا، جو رزق پیدا کرنے کی استعداد

رکھتے ہیں، یہ فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ مملکت کی طرف منتقل کردیں تاکہ انھیں محتاجوں اور محروموں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے صرف کیا جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں جسے وہ خدا کی محبت کا ثبوت قرار دیتا ہے۔ وہ زکوٰۃ کی ادائیگی پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اس کا ذکر صلوٰۃ جیسے مقدس فریضے کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ جب خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بعض قبائل نے زکوٰۃ کو مرکزی بیت المال میں بھیجنے سے انکار کردیا تو خلیفہ نے ان کے خلاف اعلان جہاد کردیا تاآنکہ انھوں نے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کردیا۔

لہٰذا اسلام میں کمزوروں اور غریبوں کی سرپرستی مملکت کی ذمہ داری ہے۔ قرآن کا نظام یہ ہے کہ ہر فرد معاشرہ کو کم از کم بنیادی ضروریات زندگی لازماً بہم پہنچائی جائیں۔ اسلئے کہ رسول اللہؐ کے الفاظ میں ہر انسان کا پیدائشی حق ہے کہ اس کے پاس رہنے کو مکان، ستر ڈھانپنے کو کپڑا، کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی ہو۔ حضورؐ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مفہوم ہے کہ مملکت کا کوئی فرد بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

ان لوگوں کی ضروریات زندگی کا اس طرح انتظام کرکے، جو اپنی روزی آپ نہ پیدا کرسکتے ہوں، قرآن اس کی پوری آزادی دیتا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کریں اور تمام جائز طریقوں سے اپنے معیار زندگی کو بلند کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ روپیہ جمع رکھنے کی ممانعت کرتا ہے اور دولت کی آزادانہ گردش کا حکم دیتا ہے۔ ہر فرد معاشرہ پر یہ شرط عائد کرتا ہے کہ معاملات میں کسی دوسرے کی کمزوری سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ بنابریں قرآن ناجائز نفع اندوزی کے تمام طریقوں کو حرام قرار دیتا ہے اور قمار بازی اور سٹہ کو ممنوع ٹھہراتا ہے۔ لیکن چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر انفرادی یا اجتماعی طریق سے تمام ایسے کاروبار کی اجازت دیتا ہے جو معاشرہ کے مفاد عمومی کے خلاف نہ جائیں۔

[اس کے بعد مصنف نے قانونِ وراثت کا ذکر کیا ہے۔ طلوع اسلام]

مزدوروں سے تعلقات

مستاجر اور اجیر کے تعلقات میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس سے مزدور کا وقار قائم رہے اور اس کے مفاد کا تحفظ ہو جائے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں مزدور دو قسم کے ہوتے تھے — غلام اور آزاد — غلام وہ ہوتے تھے جنھیں اسیر کرلیا جاتا تھا یا وہ جو اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی آزادی کو روپیہ کے عوض بیچ دیتے یا رہن رکھ دیتے تھے۔ ان بیچاروں کی حالت بڑی خراب تھی۔ رسول اللہؐ نے سب سے پہلے اپنی توجہ انہی کی طرف مبذول فرمائی۔ اس قسم کی غلامی اس زمانے میں ساری دنیا میں رائج تھی اور عربوں کی اقتصادی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ اس لئے اسے آنِ واحد میں مٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ صلعم نے ایسے طریقے اختیار فرمائے جن سے وہ غلام جو اس وقت موجود تھے انسانیت کی سطح پر آجائیں اور آہستہ آہستہ غلامی کا وجود مٹ جائے۔ [اس کے بعد مصنف نے ان طریقوں کی تفصیل لکھی ہے جن کا یہاں درج کیا جانا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ طلوع اسلام]

اسی طرح آزاد مزدوروں کا مسئلہ بھی رسول اللہؐ کے مرکز نگاہ رہا۔ آپ کا ارشاد تھا کہ "مزدور کو اس کا پسینہ خشک

ہونے سے پہلے مزدوری ادا کر دو۔" آپ نے مزدور کو حبیب اللہ کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ . . . . . اس باب میں رسول اللہ نے جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ متاجر کو ہمیشہ چاہیئے کہ وہ اجیر کے ساتھ معاملات میں عدل اور احسان کو ملحوظ رکھے۔ اور اس کی محتاجی سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔

دو ذمہ داریاں ان تمام تدابیر کی بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل یا دولت کے استعمال کے وقت ان دو ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھے جو قرآن نے اس پر عائد کی ہیں۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد یعنی ایک تو وہ ذمہ داریاں جو اس پر اس کی اپنی ذات کی ہیں، اور دوسرے معاشرہ کی ذمہ داریاں۔ قرآن نے انسانی زندگی کا جو معیار قائم کیا ہے اس کا مظاہرہ دولت کے اسراف اور عیش و عشرت کے سامان سے نہیں ہوتا۔ اس کا مظاہرہ اس شکل میں ہوتا ہے کہ فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں۔ "روحانی تقاضوں" سے مراد ہے انسان کی یہ خواہش کہ وہ معاشرہ کے تقاضوں کو پورا کرے۔ یعنی اپنی متاعِ عیش ان لوگوں کی ضروریات کے لئے بطیب خاطر دیدے جو سامانِ زیست سے محروم رہ گئے ہوں۔ اسی کو "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک یہ تقویٰ کی زندگی ہے اور یہی زندگی خدا کی نگاہوں میں واجب التکریم ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی حکومتیں چاہتی ہیں کہ وہ مغرب کے اُن متضاد و متخاصم گروہوں میں توازن قائم رکھ سکیں، جو نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت نے پیدا کر رکھے ہیں۔ تو ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ قرآن کے اقتصادی نظام کو اختیار کریں اور اسے یورپ کے متخاصم گروہوں کے سامنے پیش کریں۔ تاکہ وہ اس متوسط نظریۂ حیات کو اختیار کر کے اپنی موجودہ کشمکش کو ختم کر سکیں۔ اگر انھوں نے ایسا کر دیا تو جیسا کہ پروفیسر گب (GIBB) نے کہا ہے ان کے لئے یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ نسل اور روایات کے ان تضادات کو مٹا کر جو دنیا کی نگاہوں میں امنٹ ہیں، مشرق و مغرب کی موجودہ خلیج کو پاٹ سکیں اور اس طرح انسانیت میں وحدت قائم کر سکیں۔ پروفیسر گب (GIBB) کے الفاظ یہ ہیں:۔

اسلام کے ذمے انسانیت کی خدمت اسلام کے ذمے انسانیت کی ایک اور خدمت بھی ہے۔ اسلام مشرق سے بہ نسبت یورپ کے، زیادہ قریب ہے اور بین الاقوامی مصالحت اور روابط کی شاندار روایات کا حامل ہے۔ انسان کی مختلف نسلوں میں ایک ایسی وحدت پیدا کرنا جس میں مدارج اور مواقع اور سعی و عمل کی مساوات ہو ایک مشکل مسئلہ ہے لیکن اس باب میں جسقدر کامیابی اسلام کو ہوئی ہے تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ افریقہ ہندوستان اور انڈونیشیا کی کثیر التعداد اسلامی آبادیاں، نیز چین کی نسبتہً قلیل اور جاپان کی بہت ہی قلیل التعداد اسلامی آبادی اس حقیقت کی زندہ دلیل ہیں کہ اسلام میں اب بھی وہ قوت موجود ہے جس سے وہ نسل اور روایات کے اسقدر متضاد عناصر میں موافقت پیدا کر دے۔ اگر مشرق اور مغرب کی اقوام نے باہمی تعاون سے ایک ہونا ہے تو اس کیلئے اسلام ہی واحد ذریعہ اور سبب بن سکتا ہے۔ نہ صرف واحد بلکہ ایک لاینفک ذریعہ۔ آج یورپ کے سامنے مشرق سے متعلق جو لاینحل مسائل . . . ہیں، ان کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔ اگر اسلام کی وساطت سے مشرق اور مغرب کہیں ایک ہو جائیں تو دنیا کے

امن کے امکانات بہت وسیع ہو جائیں۔ لیکن اگر یورپ نے اسلام کے تعاون اور رابطہ سے بے اعتنائی برتی اور اس مسئلہ کو قوت کے زور پر حل کرنا چاہا، تو یہ طریق کار مشرق اور مغرب دونوں کی تباہی کا موجب بن جائے گا۔

گب (GIBB) نے یہ الفاظ قریب بیس سال پہلے لکھے تھے لیکن بین الاقوامی سیاست کی بساط پر ان کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی بیس سال پہلے تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر دنیائے اسلام اور مغرب کی جمہوریتیں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں تو اس سے دونوں کو بیحد فائدہ ہوگا۔ پروفیسر گب (GIBB) تو یہاں تک کہتا ہے کہ ــــ "جہاں اپنی ثقافتی اور اقتصادی زندگی کی مکمل نشوونما کے لئے اسلام کیلئے مغرب سے تعاون لاینفک ہے، وہاں مغرب کے لئے بھی اپنی ثقافتی اور روحانی زندگی کی نشوونما کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اسلامی سوسائٹی کی مضمر قوتوں اور امکانات سے فیض یاب ہو" ــــ اب سوال یہ ہے کہ کیا مغربی جمہوریتیں اس قسم کے تعاون کے لئے زمین تیار کریں گی؟

اسوقت اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے۔ اس خلفشار کی وجوہات ہر ملک میں مختلف ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ان کی اپنی پیدا کردہ ہیں، لیکن کچھ اس رابطہ کا بھی نتیجہ ہیں جو انھوں نے مغرب سے پیدا کیا ہے۔ کیا مغربی جمہوریتیں جس حد تک بھی وہ ذمہ دار ہیں، اس خلفشار کو کم کرنے کی کوشش کریں گی تاکہ مغرب اور اسلامی ممالک کے باہمی ارتباط اور خیر سگالی کی بنیادوں پر نئے رشتے استوار ہو سکیں؟ اس کے ساتھ ہی، کیا یہ جمہوریتیں باہمی مفاد کی خاطر اسلامی ممالک کو وہ اقتصادی اور فنی امداد بہم پہنچائینگی جس کی انھیں اس وقت اس قدر ضرورت ہے تاکہ یہ ممالک اپنے اقتصادی معیار کو بلند کر کے امن عالم کے قیام کے لئے ایک موثر قوت بن جائیں؟

یہ بات بہت جلد پردہ سے باہر آجائے گی کہ اسلامی ممالک کے ان تقاضوں کا جواب مغربی جمہوریتوں کی طرف سے کیا ملتا ہے۔ ان کی طرف سے کچھ بھی جواب ہو اور ان کے ردعمل کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کو ایک چیز اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے اور وہ یہ کہ انھیں اس روشنی کی راہنمائی میں جو اسلام انھیں عطا کرتا ہے، اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے بنانی ہوگی۔ اگر وہ اسلام کو راہنمائی طلب کریں گے تو اسلام انھیں اس راہنمائی سے کبھی مایوس نہیں کریگا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی ممالک کی موجودہ کشاکش ان کیلئے درپردہ رحمت ہے۔ یہ کشاکش اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے خواب گراں سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ان کی یہ باعزم بیداری یقیناً انھیں شاہراہِ حیات پر بہت آگے لیجائے گی۔ انھیں دوسری قوموں سے کچھ مدد ملے یا نہ ملے، اگر انھوں نے قرآن کے اقتصادی نظام کو پوری دیانت داری سے اختیار کر لیا تو ان کے محدود ذرائع کے باوجود، ان کی معاشرتی زندگی میں ایسا استحکام پیدا ہو جائے گا جو ہر فرد ملت کو انسانی معیار زیست عطا کر دے گا۔

زاویۂ نگاہ کی تبدیلی

لیکن قرآن کے اقتصادی نظام کو از سر نو اختیار کرنے کیلئے ایک بنیادی شرط ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے اندر وہ ذہنی تبدیلی پیدا کرے جو قرآن کا مقصود ہے۔ وہ ذہنی تبدیلی جو حقوق اللہ اور حقوق العباد یعنی ذاتی ذمہ داریوں اور معاشرتی ذمہ داریوں کو یکساں اہمیت دے اور جو اس نظام زندگی کے قیام کے لئے کوشاں ہو جس میں

ہر فرد دوسروں کا راعی یعنی محافظ و نگہبان بن جائے۔ یہ "ذہنیت شبانی" (یعنی وہ ذہنیت جس میں ہر فرد یہ سمجھے کہ میں انسانیت کے گلہ کا چرواہا ہوں) مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہے اور باقی نوع انسانی کے لئے بھی۔ جیسا کہ تاریخ اسلام سے ظاہر ہے، اس ذہنیت کا فروغ جمہوری ماحول میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کا نظریہ جمہوریت صالحین کی جمہوریت کا نظریہ ہے یعنی ان انسانوں کی جمہوریت جو زندگی میں پورا توازن اور قرار پیدا کرتے ہیں اور انسانی معاشرہ کو ہر قسم کے سلب و نہب سے محفوظ رکھتے ہیں۔ کیا آج کی دنیا اس کے لئے تیار ہے کہ صفحۂ ارض پر اس قسم کی جمہوریتوں کا جال بچھ جائے جس میں ہر جمہوریت باقی جمہوریتوں کی نگہبانی کا فریضہ انجام دے؟ یہی قرآن کی دعوت ہے اور یہی وہ نہج زندگی ہے جو اس کا مطلوب و مقصود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باقی ماندہ دنیا سردست قرآن کی اس دعوت پر کان نہ دھرے اور اسے درخور اعتنا نہ سمجھے۔ لیکن اگر مسلمانوں نے بھی اس سے اعراض برتا تو اس کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر مسلمانوں کی موجودہ نسل اتنا کرلے کہ وہ اس غلط مذہب کو چھوڑ کر جو ازمنۂ متوسطہ سے ان کے ہاں وراثۃً چلا آتا ہے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صفاتِ خداوندی کو منعکس کرلے اور جس جمہوری انداز زندگی کی طرف قرآن راہنمائی کرتا ہے اسے اختیار کرلے، تو ان میں آج بھی ان صلاحیتوں کی نمود ہو سکتی ہے جو انھیں حوادث زمانہ کے زلزلوں سے محفوظ رکھ سکیں اور جن کی قوت سے یہ امن عالم کے قیام کا ایک موثر ذریعہ بن سکیں۔

مژدہ باد

کہ محترم پرویز صاحب نے

قرآنی نظامِ ربوبیت

کی تکمیل کردی ہے

یہ دورِ حاضرہ کی بے مثال کتاب ہے

ملّت میں پارٹیوں کی ضرورت نہیں

شش سالہ تجربات کی روشنی میں

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

سیاسیاتِ عالم میں پاکستان ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے کیونکہ کوئی ملک اس بنا پر معرضِ وجود میں نہیں آیا کہ اس کے باشندے عام ماحول سے کٹ کر ایک آزاد فضا میں اپنے تصورات کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے متمنی ہوئے ہوں۔ لیکن جسقدر حیران کن پاکستان کی وجہ تخلیق ہے اس سے کہیں بڑھ کر حیران کن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانانِ پاکستان فرعونی مصر سے نکل کر تیہ کی وادی میں کچھ ایسے کھوئے کہ وہ منزلِ مقصود کے تمام نشانات ایک ایک کرکے بھول گئے چنانچہ ہماری چھ سال کی نام نہاد آزاد زندگی آوارگیِ فکر و عمل کی تاسف انگیز داستان ہے۔

اس آوارگی اور بے راہروی سے کہیں بڑھ کر جگر پاش حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ایک مرتبہ بھی اس سیلِ بے پناہ کی رو سے ایک طرف ہوکر زمین پر قدم ٹکا کر یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ بالآخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ اگر ہم پاکستانی زندگی پر نگہ بازگشت ڈالیں تو یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ہم نے اپنا مطالبہ علیحدگی تسلیم تو کرا لیا لیکن اس کے تقاضوں سے اب تک بے خبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا نظامِ سیاسی سابقہ نظام کی بھونڈی تقلید ہے اور بس۔ ہم نے اپنے نصب العین (IDEOLOGY) کو عملی زندگی کے قالب میں ڈھالنے کی مطلقاً سعی نہیں کی۔ پاکستان میں ہماری اولیں ضرورت آئینِ اسلامی کی تدوین تھی لیکن چھ سال کے بعد بھی ہنوز روزِ اول والا معاملہ ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے صورتِ حال ابتر ہے کیونکہ ہم نے اس ضمن میں بہت کچھ طومار ایسا جمع کر لیا ہے جس نے ہماری ذہنی پراگندگی میں چند در چند اضافہ کرکے ہمارے کام کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ اسلام کے نام پر ملک کا مطالبہ کرنے والے اس بنیادی حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام ملت کی تشکیل کن بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ قرآن تمام انسانوں کو ملتِ واحدہ متصور کرتا ہے اور کسی قسم کی بین الانسانی تفریق کا روادار نہیں بجز ان کے جو اس وحدتِ انسانی کی مخالفت کریں جو وحدتِ خالق و وحدتِ قانون پر متفرع ہے۔ تمام انسانوں کو ایک سلک میں منسلک کرنے کے لئے قرآن کا قدمِ اول ملتِ اسلامیہ کی تشکیل ہے چنانچہ قرآن ملت کی عمارت "ائتلاف" کی ابدی بنیادوں پر تعمیر کرتا ہے۔ یہ بنیاد اور وہ عمارت ــــ اصلھا ثابتٌ وفرعھا فی السماء کی تفسیر ہیں لیکن مسلمانانِ پاکستان نہ محض یہ کہ یہ نکتہ نہیں سمجھے بلکہ تحریکِ پاکستان کی سیاسی جدوجہد کا بنیادی نکتہ بھی سمجھنے سے

قاصر رہے۔ اندریں حالات یہ تعجب کی بات نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد ان کا پہلا قدم ہی غلط پڑا۔

تثلیثی نظریہ سیاست

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان غیر منظم تھے اور کئی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، ایک ہی امیر کے پیچھے اور ایک ہی مطالبہ پر قائم۔ اس طرح مسلم لیگ بتدریج ملت اسلامیہ کے مترادف ہو گئی۔ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کا مرتبہ اور بلند ہو گیا اور وہ حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن ہماری بدبختی کا یہ حال کہ قائدین مسلم لیگ نے یہ سمجھا کہ مسلم لیگ کو ملت کے بحر بیکراں کی طرح موج انگیز ہونے کے بجائے ایک سیاسی پارٹی کی جوئے کم آب کی طرح بنا چاہیے، حالانکہ یہ صورت اس کا گلا گھونٹ دینے کے مترادف تھی نہ کہ اس کی زندگی کی ضامن۔ اس سے پاکستان "تثلیثی" نظریے کا شکار ہو گیا۔ ایک طرف ملت اسلامیہ پاکستانیہ، دوسری طرف مسلم لیگ، اور تیسری طرف حکومت پاکستان۔ اس تثلیث میں آج تک توحید پیدا نہیں ہو سکی اور ہم بدستور تشتت و افتراق کا شکار چلے آ رہے ہیں۔

اب ذرا حالات کا جائزہ لیجئے کہ اس نظریے نے عملی زندگی میں کیا کیا گل کھلائے۔ تحزب (PARTY SYSTEM) نظم جمہوری کا لازمہ ہے۔ عہد حاضر کی کامیاب جمہوریتوں مثلاً امریکہ اور انگلستان میں منظم سیاسی جماعتیں برسر کار ہیں۔ یہ نظر ظاہر یہ طریق کامیاب معلوم ہوتا ہے۔ اس کامیابی کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ جو نظام سیاسی ان ممالک میں رائج ہے وہ ان قوتوں نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد از خود تراشا ہے۔ وہ نہ محض ان کے مزاج کے مطابق ہے بلکہ زمانے کی مقتضیات کے مطابق وہ اس میں تغیر و تبدل کرتی رہتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تہذیب و تعلیم میں وہ قومیں اتنی ترقی یافتہ ہیں کہ انھیں ملک و قوم کے مفاد عمومی کا پورا پورا شعور حاصل ہے۔ ان قوموں کی مختلف سیاسی جماعتیں جب ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں تو ہر چند وہ حصول اقتدار کے لئے ساعی ہوتی ہیں، تاہم وہ اس جنگ میں ملکی مفاد کو پس پشت نہیں ڈالتیں، بلکہ وقت آ پڑنے پر ہنگامی اتحاد عمل کا مظاہرہ بھی کرتی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں جو نظام سیاسی رائج ہے وہ ہمارا اپنا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس دور کی یادگار ہے جس سے ہم نے لڑ کر گلو خلاصی کرائی ہے۔ نیز ہمارے ہاں شعور سیاسی و قومی کا اتنا فقدان ہے کہ ہم اس نظام کو مغرب کے اندازے کے مطابق کامیاب بنا ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ دیکھئے کہ ہم نے جس نظام کو زبردستی اپنے اوپر مسلط کیا ہے وہ کس بری طرح ناکام ثابت ہوا ہے۔

مسلم لیگ اور ملت اسلامیہ

قیام پاکستان کے وقت ہم میں ایک ہی سیاسی جماعت تھی اور وہ تھی مسلم لیگ۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس جماعت کو حالات نے جو ارفع مقام عطا کر دیا تھا ہم نے اسے اس سے نیچے گرا لیا۔ عین اس حالت میں کہ مسلم لیگ ملت اور ملت کی مرکزی حکومت بن چکی تھی، ہم نے اسے عام سیاسی جماعت کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور جماعتیں بھی معرض وجود میں آنا شروع ہو گئیں۔ ایسا ہونا بالکل ناگزیر تھا کیونکہ ایک تو متعدد احزاب سیاسی جمہوری نظام کا لازمہ ہیں۔ دوسرے ایک جماعت کا وجود ہی دوسری جماعتوں کے قیام کی دعوت بن جاتا ہے۔ لہٰذا اگر حکماً دوسری جماعتوں پر پابندی نہ لگائی جائے تو ان کا قیام و تعدد قابل فہم ہے۔ دوسری جماعتوں کے معرض وجود میں آ جانے سے مسلم لیگ کو اپنے تحفظ و بقا کا لازماً زیادہ خیال پیدا ہو گیا۔ اس طرح قائدین پاکستان کا مسلہ دوگونہ ہو گیا۔ ایک طرف تو ان کے

پیش نظر حکومت اور مہمات امور حکومت تھے اور دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کا استحکام۔ وہ ان سے بطریق احسن عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اول تو تقسیم ہند نے ایسی ہنگامی صورت حال پیدا کر دی کہ قائدین پاکستان کی توجہ تمام تر ان مسائل کے حل پر مرکوز ہو گئی، دوسرے اگر یہ صورت حال نہ بھی پیدا ہوتی تو بھی پاکستان کی لوح سادہ پر نئے نظام کے خطوط کھینچنے کا کام ایسا دشوار تھا کہ اس سے عہدہ برآ ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ان ہر دو صورتوں میں قائدین پاکستان کے لئے حکومت کے کاروبار کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کے کاروبار کی طرف توجہ دینا از قبیل محالات تھا۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں بلکہ تجربے نے بتا دیا کہ ایسا کرنا واقعی سہل نہیں۔ حکومت کے کاندھے پر ایک پارٹی کی لاش رکھ دی جائے تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے کراچی میونسپل کارپوریشن کے حالیہ انتخابات پر نگاہ ڈالئے۔ کراچی کارپوریشن کے انتخابات — آٹھ کروڑ آبادی میں سے صرف گیارہ لاکھ آبادی سے متعلق انتخابات — لیکن حکومت کا یہ حال تھا کہ خواجہ ناظم الدین اور ان کے وزراء صبح و شام اس بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ کراچی کارپوریشن کے ارکان فلاں ہوں فلاں نہ ہوں کراچی شہر کی اہمیت جس قدر بھی ہو بہرحال وہ ایک شہر ہے، لیکن اس کے انتخابات حکومت پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال بنے ہوئے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کا سارا کاروبار معطل کر دیا گیا ہے اور تمام تر توجہ صرف اسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دی گئی ہے۔ اگر حکومت پاکستان کسی پارٹی کی محتاج نہ ہوتی تو اسے یہ فکر بھی نہ ہوتی کہ کارپوریشن کے رکن کون بنتے ہیں اور کون نہیں۔ کیونکہ جو کوئی بھی ہوتا وہ کراچی کا شہری ہوتا اور پاکستانی۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح بے کار کاموں پر محنت اور قوت ضائع ہوتی ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد اس کا احساس پیدا ہوتا نظر آتا تھا۔ چنانچہ قائد اعظم کی حین حیات میں ہی ۱۹۴۸ء کے اوائل میں یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ حکومت کے ارکان مسلم لیگ کے عہدیدار نہ ہوں اور علی ہذا القیاس لیگ کے عہدیدار حکومت کے کارندے نہ بن سکیں۔ یہ دراصل خاموش اعتراف تھا اس حقیقت کبریٰ کا کہ اب مسلم لیگ کو علیحدہ طور پر زندہ رہنے کی ضرورت نہیں بلکہ ملت کے مسائل مہمہ کا حل صحیح اور زندہ نظام حکومت میں ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ حکومت کا چلانا جماعتی وجود پر مقدم تھا۔ اس طرح تین چار سال گذر گئے۔ جب قائدین مسلم لیگ کو ہوش آیا تو انہوں نے یہ حیرتناک منظر دیکھا کہ مسلم لیگ کا جماعتی وجود بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اسے پھر سے زندہ کرنے کی بظاہر کوئی شکل نہیں رہی تھی، لیکن اسے ختم کر دینے کے بجائے مسلم لیگ اور حکومت کی قیادت کو یکجا کر دیا گیا۔ یعنی مرکز میں وزیر اعظم پاکستان کو مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا اور صوبوں میں وزرائے اعلیٰ صوبائی مسلم لیگوں کے صدر بن گئے۔ اس سے بظاہر یہ دکھائی دینے لگا کہ مسلم لیگ بھی زندہ جماعت ہو گئی ہے۔ لیکن یہ بہت بڑا مغالطہ تھا کیونکہ یہ زندگی عکس تھی حکومت کی زندگی کا۔ مسلم لیگ کا جماعتی نظام دیکھنا ہو تو ذرا اس کے ارکان کی تعداد دیکھئے۔ رکنیت کی فیس کی وصول کا جائزہ لیجئے اور دیکھئے کہ اس کے اجلاس کب اور کس انداز سے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں مسلم لیگ کا ایک بھی سالانہ اجلاس نہیں ہوا اور کسی کو بھی اس کمی کا احساس نہیں۔ اس سے بڑھ کر کسی جماعت کے مردہ ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ مزید دیکھئے کہ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں مسلم لیگ کے موجودہ صدر، خواجہ ناظم الدین، کا انتخاب ہوا تھا۔ انہوں نے آج تک اپنی مجلس عاملہ کو نامزد نہیں کیا حالانکہ کوئی آٹھ ماہ گذر چکے ہیں اور انہوں نے متعدد مرتبہ وعدہ کیا ہے کہ وہ عنقریب اس کا اعلان کر دیں گے[1] ایک موقع پر تو

[1] اس مقالہ کی تسوید کے بعد یہ خبر آئی کہ خواجہ صاحب نے مجلس عاملہ کے ارکان کا اعلان کر دیا ہے۔

ورکنگ کمیٹی کی ضرورت پڑ ہی گئی جب یہ خیال کئے بغیر کہ وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، خواجہ صاحب نے مسٹر کھوڑو کو یہ دھمکی دی کہ وہ مرکزی ورکنگ کمیٹی سے سفارش کریں گے کہ ان کے خلاف تعزیری کارروائی کرے۔

پارٹی اور حکومت کا تعلق کسی سیاسی جماعت کی زندگی اور فعالیت کا آئینہ وہ ضابطہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ اپنی نامزد حکومت سے تعلق استوار کرتی ہے۔ مسلم لیگ کو پاکستان میں حکومت کرتے چھ سال ہونے کو آئے ہیں لیکن پارٹی اور حکومت کا تعلق کبھی واضح نہیں ہو سکا، حالانکہ جمہوری روایات کے مطابق پارٹیاں حکومتوں پر فائق ہوتی ہیں۔ مسلم لیگ کا اپنی حکومتوں کو کوئی پروگرام۔ یا منشور ہدایت۔ دینا یا ان حکومتوں کا اس کے مطابق عمل کرنا تو ایک طرف رہا۔ اہم حکومتی تبدیلیاں تک اس پارٹی کے علم، مشورہ یا ہدایت کے بغیر معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔ (مسلم لیگ نے اس دوران میں اگر کچھ کیا ہے تو محض یہ کہ اجلاس طلب کر کے مرکزی یا صوبائی حکومتوں کے فیصلوں پر صاد کر دیا ہے۔) نمونے کے طور پر تازہ ترین مثالوں کو لیجئے۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو گورنر جنرل نے نااہل قرار دیکر برطرف کر دیا اور اس کے بجائے ایک نئی کابینہ مرتب ہو گئی۔ خواجہ صاحب ایک طرف برطرف شدہ وزیر اعظم ہیں اور دوسری طرف مسلم لیگ کے صدر۔ جمہوری قاعدے کے مطابق نئی حکومت کو مسلم لیگ کی طرف سے نامزد ہونا چاہئے تھا کیونکہ نئی کابینہ بھی مسلم لیگی کابینہ ہے۔ یہاں اس الجھاؤ کو چھوڑئیے کہ خواجہ ناظم الدین سے استصواب رائے مناسب نہیں تھا سوال مسلم لیگ کے ڈسپلن کا ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ مرکزی کابینہ اس کے علم اور مشورے کے بغیر مرتب ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو مسلم لیگی حکومت ہی کہتی ہے۔ اسی طرح سندھ کی نئی وزارت کی مثال لیجئے۔ اس صوبے کے منتخب مسلم لیگی ارکان نے اپنے لیڈر۔ وزیر اعلیٰ کے انتخاب میں صدر مسلم لیگ سے نہیں بلکہ وزیر اعظم پاکستان سے استصواب کیا۔ بحالات موجودہ یہ انسب تھا یا نہیں، اسے رہنے دیجئے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ مسلم لیگ کے جماعتی نظام کی یہ کیفیت ہے کہ صوبے کی وزارت اپنی جماعت سے نہیں بلکہ مرکزی حکومت کے وزیر اعظم ـــــ جو خود جماعت کے مشورے کے بغیر فائز اقتدار ہوئے ـــــ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتی ہے اور صدر مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ یہی کچھ پنجاب میں ہوا۔ وہاں میاں ممتاز دولتانہ نے وزارت تو چھوڑ دی لیکن صوبائی مسلم لیگ کی صدارت بدستور ان کے قبضے میں رہی۔ ان کے دیکھتے دیکھتے مشرقی پاکستان کے گورنر ملک فیروز خاں نون کو بلا کر صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا لیکن کسی نے صوبائی لیگ کے صدر سے اس ضمن میں مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ صوبہ سرحد کی نظیر بھی کچھ کم سبق آموز نہیں۔ وہاں وزیر اعلیٰ کے تقرر کا سوال پیدا ہوا تو ایک پولیس افسر کو استعفیٰ دلا کر وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا جو اسمبلی کے رکن تک نہیں۔ مسلم لیگ کو اپنے نمائندوں میں سے ایک شخص بھی اس عہدہ کے قابل نہ مل سکا۔ اس سے مسلم لیگ کی جماعتی زندگی کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اگر آج حکومتوں کے وزراء مسلم لیگ کے عہدیدار نہ رہیں، نیز یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ مسلم لیگ کے عہدیدار بھی سرکاری عہدیدار نہیں بن سکیں گے تو مسلم لیگ کا رہا سہا نظام بھی کالعدم ہو جائے۔ اس میں اگر کوئی زندگی ہے تو وہ حکومت کے دم سے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مصنوعی تنفس سے کب تک مسلم لیگ کو زندہ رکھا جا سکیگا؟

سیاسی لطیفہ اب مسلم لیگ کے نظام میں ایک اور لطیفہ ملاحظہ کیجئے۔ ۱۹۴۸ء میں اس کے دستور میں تبدیلی کی گئی جس کی

رہے یہ فیصلہ ہوا کہ حکومت کے عہدیدار جماعت کے رکن نہیں ہو سکتے۔ دوسرے سال جب "وحدت کمان" کی ضرورت محسوس ہوئی تو دستور میں تبدیلی کر کے مرحوم لیاقت علی خاں، وزیر اعظم، کے صدر مسلم لیگ بننے کا راستہ صاف کیا گیا۔ تیسرے سال پھر دستور بدلا گیا تاکہ خواجہ ناظم الدین جو گورنر جنرل ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کے رکن نہیں رہے تھے، وزیر اعظم بننے کے بعد اس کے صدر بن سکیں۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن اب مسلم لیگ ایک عجیب الجھن میں پڑ گئی ہے۔ "وحدت کمان" نے جو گل کھلایا ہے اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ خواجہ ناظم الدین وزارتِ عظمیٰ سے تو برطرف کر دیئے گئے لیکن صدارت کی گدی پر بدستور متمکن ہیں۔ جماعتی نظم کی رو سے اگر وہ صدارت سے علیحدہ ہوتے تو وزیر اعظم بھی نہ رہتے، یا یوں کہئے کہ جب تک وہ صدر مسلم لیگ رہتے وہ وزیر اعظم پاکستان بھی رہتے لیکن یہ صورت کسی کے تصور میں بھی نہ آ سکی کہ ایک شخص کو وزارت عظمیٰ سے تو علیحدہ کر دیا جائے گا مگر وہ صدارت سے نہیں ہٹایا جا سکے گا۔ اب نہ محض "وحدت کمان" کا تصور باطل ہو گیا بلکہ مسلم لیگ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس الجھن کا حل کیا ہو۔ خواجہ صاحب اگر از خود صدارت سے دستبردار نہ ہو جائیں تو ان کے ہٹانے کا طریقہ یہ نظر آتا ہے کہ ان کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ منظور کیا جائے۔ لیکن اس صورت میں ان کے خلاف وہ الزامات عائد کئے جائیں گے جن کی خواجہ صاحب کے دورِ حکومت میں تعریفیں کی جاتی تھیں۔ اور اگر عدم اعتماد کا سہارا نہ لیا جائے تو خواجہ صاحب حکومت کے محتسب بن کر صدارت پر فائز رہیں گے۔ گویا خواجہ صاحب کو وزارت سے نااہلیت کی بنا پر علیحدہ کر دینے کے باوصف وزارت پر فائق بنا دیا گیا۔ وہ چاہیں تو جماعتی زور سے اس نئی وزارت کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔

مخالف جماعتیں

یہ تو مسلم لیگ کی حالت ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری جماعتوں کو دیکھئے۔ گذشتہ چھ سال میں کہ مسلم لیگ اس طرح بتدریج حالتِ موت تک پہنچی ہے، دوسری مخالف جماعتیں یا تو پیدا ہی نہیں ہو سکیں یا پیدائش کے فوراً بعد مردہ ہو گئیں۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس دوران میں کوئی قابل ذکر حزب مخالف معرض وجود میں نہیں آ سکی حالانکہ اس کیلئے حالات نہایت سازگار تھے۔ اول تو مسلم لیگ مردہ تھی اور اس خلاء کو پر کرنے کے لئے ہی ایک جماعت ناگزیر تھی۔ دوسرے اگر مسلم لیگ کو زندہ متصور کیا جائے تو اس کی نامزد حکومت نے عوام میں اپنے آپ کو غیر مقبول بنانے کے ایسے وافر سامان مہیا کر لئے تھے کہ ان کے زور پر ایک نئی جماعت کو اٹھایا جا سکتا اور ملک و قوم کی ہمدردیاں حاصل کی جا سکتی تھیں۔ یوں تو ہر برسر اقتدار پارٹی کی یہ صورت ہوتی ہے کہ عملی نظم و نسق میں اس سے جو قابل فہم اجتہادی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، ان کی بدولت وہ عوام میں ایک حد تک غیر ہر دلعزیز بن جاتی ہے، لیکن مسلم لیگ کی حکومت، خصوصیت سے خواجہ ناظم الدین کی حکومت، سے ایسی بنیادی اور فاش غلطیاں سرزد ہوئیں کہ ملک ایک بحران میں مبتلا ہو گیا اور بالآخر وہ حکومت اسی کی پاداش میں برطرف کر دی گئی۔ ایسی نااہل اور بدنام حکومت کے خلاف رائے عامہ کو بیدار و منظم کرنا بڑا سہل کام تھا۔ حیرت کا مقام ہے کہ مخالف صف میں اچھے چابکدست سیاست دان بھی موجود تھے لیکن وہ ملک گیر جذبۂ ناراضگی کو ایک حزب اختلاف میں منظم نہ کر سکے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہمارے ہاں حکومت کے مخالف لیڈر تو موجود ہیں لیکن مخالف جماعتیں مفقود ہیں۔ ان لیڈروں نے ہر چند سیاسی جماعتوں کی داغ بیل بھی ڈالی رکھی ہے لیکن ان کی حیثیت محض کاغذی ہے اور ان کا وجود ان کی ذات تک محدود ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی اسمبلی ہو یا صوبائی

اسمبلیاں، یا عام انتخابات ہوں کامیابی ہر جگہ مردہ مسلم لیگ کی ہوتی ہے۔ کیا اس قسم کی مردہ جماعت سے کسی زندگی بخش اقدام کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بساطِ سیاست سونی پڑی ہے۔ کسی سیاسی جماعت کا کوئی وجود نہیں۔ صرف ایک متحرک ادارہ ہے اور وہ ہے حکومت۔ یہ ادارہ کبھی معطل نہیں ہوسکتا۔ اس کی حرکت ہر وقت باقی رہتی ہے عام اس سے کہ وہ باعثِ برکت ہو یا موجبِ زحمت۔ یہ صورتِ حال بحرانی ہے لیکن اس میں خیر کا بھی پہلو ہے۔ اور خیر کا بھی ہم اگر ذرا رک کر گذرے ہوئے چھ سالوں کے تجربے کا ایک بار جائزہ لے لیں اور اس سے عبرت حاصل کریں تو اسے مفید مطلب بنایا جاسکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ پارٹی بازی کے تجربے نے ہمیں بحران سے دوچار کر دیا اور عملاً یہ ثابت کر دیا کہ اس ملک میں —— بحالاتِ موجودہ ہی سہی —— کوئی سیاسی جماعت پنپ نہیں سکتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا بطلان ناممکن ہے۔

پس چہ باید کرد! لیکن کیا اب یہ ممکن ہے کہ اس تجربے کی روشنی میں آئندہ لائحہ عمل متعین کیا جاسکے؟ یہ یقیناً ممکن ہے لیکن اس کی ابتدا خود حکومت کی طرف سے ہونی چاہئے۔ اس وقت اگر اربابِ اقتدار یہ اعلان کر دیں کہ چونکہ تجربہ تجربے نے ناممکن العمل ثابت کر دیا ہے اس لئے مسلم لیگ کو ختم کر دیا جاتا ہے، تو ہمارے جسدِ سیاسی میں ایک تازہ حرکت پیدا ہو جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ اعلان ایک حقیقت کا اعتراف ہوگا اور بس۔ مسلم لیگ تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے صرف اس کے متعلق علانیہ یہ کہنا ہے کہ یہ جماعت ختم ہو چکی ہے۔ اتنا کرنے سے دوسری جماعتیں بھی ختم ہو جائیں گی کیونکہ ان کا وجود —— خواہ وہ کاغذی ہی کیوں نہ ہو —— مسلم لیگ کے وجود سے ہے۔ اس طرح میدان صاف ہو جائے تو نظمِ سیاسی کو نئے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے اور ایک ایسا انقلابی تجربہ کیا جاسکتا ہے جس کی نظیر اس دور میں نہیں مل سکتی۔ یاد رکھئے اس تجربے کے بغیر ہم نظامِ اسلامی اپنے ہاں رائج کر ہی نہیں سکتے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے طلوعِ اسلام گذشتہ پانچ سال سے دہرا رہا ہے۔

یہ فیصلہ روحِ عصر کے تقاضوں سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوگا۔ حکومت کی ضرورت سوسائٹی کے لئے کیوں درپیش آئی؟ یہ علیحدہ مبحث ہے اور پیشِ نظر موضوع سے خارج، لیکن حکومتی نظام کے ارتقا سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ تدریجاً اس کا دائرہ اثر تمام سوسائٹی پر محیط ہو گیا ہے۔ ابتداءً حکومت کے علاوہ کئی غیر حکومتی ادارے متفرق قوموں میں مصروفِ عمل رہے ہیں، لیکن اب ایسے ادارے براہِ راست حکومت کی تحویل میں آتے جا رہے ہیں اور حکومت کے فرائض اتنے وسیع ہوتے جا رہے ہیں کہ کوئی فرد اور اس کا کوئی عمل حکومت کی دسترس سے باہر نہیں رہ گیا۔ ترقی یافتہ ممالک مثلاً انگلستان اور امریکہ کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں سیاسی جماعتوں کی تعداد بھی گھٹتی جا رہی ہے۔ امریکہ کا تو نظامِ سیاست چل ہی دو پارٹیوں کے تصور پر رہا ہے۔ انگلستان میں بھی عملاً دو پارٹیاں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ یہ کم سے کم پارٹیاں ہیں جو ایک پارٹی سسٹم میں قائم ہو سکتی ہیں۔ یہ رجحانات بڑے اہم ہیں اور ہمیں ان کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ پارٹیوں کی کثرت ملک و قوم کے لئے باعثِ رحمت نہیں۔

اسلام تحزب سے پاک ہے!

ان ممالک کے تجربات کے علاوہ اگر ہم قرآن پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ قرآن جس ہیئت اجتماعیہ کا تصور دیتا ہے وہ تحزب سے یکسر پاک ہے اس کے نزدیک پوری کی پوری ملت ایک پارٹی ہے۔ ملت کے اندر پارٹیاں اس کے نزدیک شرک کے مرادف ہیں۔ اس نکتہ کو کئی بار طلوع اسلام میں وضاحت سے پیش کیا جا چکا ہے اس لئے اس موقع پر اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا اب جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سیاستِ عالم کا رجحان یہی ہے، اسلام منشا و تقاضا یہی ہے اور اس کے خلاف ہمارا تجربہ ناکام ہو چکا ہے، پاکستان کو یہ اعلان کرنا چاہئے کہ ملت اسلامیہ فی ذاتہ ایک پارٹی ہے اسے مزید پارٹیوں میں تقسیم کرنا مہلک ہے۔

اس اعلان کے بعد ہمارا لائحہ عمل بالکل صاف اور سہل ہوگا۔ ہم ملت کے کندھوں پر سے "تثلیثی نظریے" کا جوا اتار کر اس توحیدی نظریے کو یوں عمل میں لائیں گے۔ تمام ملت کو بلا تفریق کم سے کم اکائیوں میں تقسیم کیجئے۔ مثلاً ایک اکائی پانچ سو افراد پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے ہاں انتخاب و مشاورت کا نظام تشکیل کریں جو درجہ بدرجہ بلند سے بلند تر ہوتا ہوا مرکز تک آپہنچے۔ اس نظام میں ہر فرد ملت شریک ہوگا اور کوئی اس سے باہر نہیں ہوگا۔ نہ کوئی برسر اقتدار پارٹی ہوگی نہ حزب مخالف۔ سب ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہونگے، ایک ہی نصب العین کے حصول کے متمنی اور باہمی مشاورت سے طے شدہ لائحہ عمل پر کامل یکسوئی اور ہم آہنگی سے چلنے والے۔ ان کی ہر حرکت اجتماعی ہوگی اور ایک ہی منزل کی جانب۔ یوں ملت اسلامیہ رواں دواں اپنے نصب العین کی طرف بڑھتی جائے گی تا آنکہ اشرقت الارض بنور ربھا کے مصداق تمام کرۂ ارض ایک ہی نظام ربوبیت کی تحویل میں آجائے۔

من انصاری الی اللہ

ایک یا چند دینی رفیقوں کی فوری ضرورت ہے جو خدمت و دینی دعوت کی تڑپ رکھتے ہوں، مگر مالی دشواریاں ان کی راہ میں حائل ہوں۔ ملنے سے پہلے خط و کتابت کریں۔

پتہ:۔ محمد احمد بٹلہ دارالشوریٰ۔ صدر۔ کراچی

فون ۳۰۲۲۴

آئندہ شمارے میں

سلیم کے نام ایسا خط شائع ہو رہا ہے جس میں تقدیر کے مسئلہ پر اچھوتے انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔

یہ مفصل خط اور بیحد اہم موضوع ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل ؟

وہ کونسا مسلمان ہے جس کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اسقدر پست اور ذلیل کیوں ہیں ؟ لیکن اس کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ اس کا جواب آپ کو ملے گا۔

اسبابِ زوالِ امت

ہیں۔ جو دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ مختصر لیکن ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ۔ محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب ونگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا ؟ اس کتاب کا نسخہ ہر نوجوان کے سرہانے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے ہم دوبارہ زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ ضخامت ایک سو پچاس صفحات۔ کتاب، طباعت، کاغذ، معیاری۔ قیمت مجلد مع طلائی گرد پوش ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

نوٹ: جو حضرات زیادہ مقدار میں خرید کر نوجوانوں میں مفت تقسیم کرنا چاہیں ان کو خاص رعایت دی جائے گی۔

مُلّا کا مذہب کیا ہے؟

اور

وہ کس طرح قرآن کے خلاف ملا ازم کی خود ساختہ بنیادوں پر قائم ہے ؟

اگر آپ صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو ــ تین اہم عنوانات ــ کا مطالعہ کیجئے۔ جس سے ملا کے مذہب کے عجیب وغریب حقائق آپ پر منکشف ہونگے۔ مثلاً

(۱) تبدیل مذہب کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے گا۔

(۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جا سکیں گی۔

(۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جا سکے گا۔

یقیناً آپ کے دل میں بار بار سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ کیا درحقیقت اسلام یہی ہے اور کیا منزل من اللہ دین میں ان امور کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

قرآن کی روشنی میں ان تینوں مسائل کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو فوراً "تین اہم عنوانات" کا مطالعہ کیجئے۔ کتاب مجلد مع گرد پوش ضخامت ۲۱۲ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

ہیں آج کیوں ذلیل ؟

وہ کونسا مسلمان ہے جس کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اسقدر پست اور ذلیل کیوں ہیں ؟ لیکن اس کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ اس کا جواب آپ کو ملے گا۔

اسبابِ زوالِ امت

ہیں۔ جو دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ مختصر لیکن ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ۔ محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا ؟ اس کتاب کا نسخہ ہر نوجوان کے سرہانے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے ہم دوبارہ زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ ضخامت ایک سو پچاس صفحات۔ کتاب، طباعت، کاغذ، معیاری۔ قیمت مجلد مع طلائی گرد پوش ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

نوٹ : جو حضرات زیادہ مقدار میں خرید کر نوجوانوں میں مفت تقسیم کرنا چاہیں ان کو خاص رعایت دی جائے گی۔

مُلّا کا مذہب کیا ہے؟

اور

وہ کس طرح قرآن کے خلاف ملا ازم کی خود ساختہ بنیادوں پر قائم ہے ؟

اگر آپ صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو ۔۔۔ تین اہم عنوانات ۔۔۔ کا مطالعہ کیجئے۔ جس سے ملا کے مذہب کے عجیب و غریب حقائق آپ پر منکشف ہونگے۔ مثلاً

(۱) تبدیل مذہب کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے گا۔

(۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جا سکیں گی۔

(۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جا سکے گا۔

یقیناً آپ کے دل میں بار بار سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ کیا درحقیقت اسلام یہی ہے اور کیا منزل من اللہ دین میں ان امور کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ قرآن کی روشنی میں ان تینوں مسائل کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو فوراً "تین اہم عنوانات" کا مطالعہ کیجئے۔ کتاب مجلد مع گرد پوش ضخامت ۲۱۲ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

میں تائید کرتا ہوں

[جون ۱۹۵۳ء کے "طلوع اسلام" میں محترم خورشید عالم صاحب کا ایک مضمون میرے دیرۂ ترکی "بے خوابیاں" شائع ہوا ہے۔ سطور ذیل اس سے متاثر ہو کر لکھی گئیں — عرشی]

ایک بے حد اہم نکتے کے متعلق کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ بھی اسے عام مضمون نہ سمجھ کر ذرا سنجیدگی سے غور فرمائیں ہر وہ صاحب جو ان سطور کو پڑھ رہے ہیں، یہ نہ خیال فرمائیں کہ ان کے مخاطب اُن کے سوا دوسرے لوگ ہیں۔ بلکہ انھیں سمجھنا چاہئے کہ راقم اپنی گزارش کی طرف تنہا انہی کو متوجہ کر رہا ہے۔

عرض یہ ہے کہ آج تک ملت کی اصلاح و احیا کے لئے بے شمار تحریکیں وجود میں آئیں، جن میں کئی ایک حد تک کامیاب ہوئیں اور کئی ناکام بھی رہیں۔ محرکین و مصلحین میں عموماً دو قسم کے لوگ سامنے آئے۔ اول ایسے اصحاب جنھوں نے اپنا محدود فرقہ وارانہ حلقہ قائم کیا اور مسلمان رہتے ہوئے ملت کے عمومی مفاد سے الگ ایک نئی قسم کے مسلمان بن گئے۔ ایسے بزرگوں کی بدولت قوم کی مجموعی ہستی کو ہر عہد میں ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔ ان کا ایسا اقدام اسلامی تعلیمات کی روح سے جہالت یا اپنی دکان دارانہ پالیسی پر مبنی تھا۔

دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جنھوں نے تمام ملت اسلامیہ کے وقار و تمکین کو اپنا نصب العین بنایا، فرقہ سازوں کی طرح وہ اپنی زندگیوں میں عموماً قبول عام کی سند تو حاصل نہ کر سکے، لیکن نتیجے کے لحاظ سے اسلام کے قریب وہی تھے اور ان کے وسیع و مستقل فوائد ساری قوم کو پہنچے، وہ لوگ جنھوں نے ان کو گالیاں دینا، بلکہ قتل کرنا ثواب عظیم سمجھا، وہ اور ان کی نسلیں بھی ان فداکارانِ ملت کی مساعی جمیلہ سے مستفیض ہوئیں۔

اس قسم کے بے نفس خدام ملت ہماری تاریخ میں بہت سے مل جاتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے پیچھے نہ اپنے نام سے منسوب کوئی فرقہ چھوڑا اور نہ کوئی سلسلہ مریدین، لیکن ان کے کارنامے زندہ جاوید ہیں۔ ہم اسوقت ایسی کوئی تصنیف کرنے نہیں بیٹھے ورنہ اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، جو دوست بصیرت و مطالعہ رکھتے ہیں، ان کیلئے یہ اجمال و اشارہ کافی ہے۔ تاہم ہمیں اپنے ماضی قریب سے اپنے اس خیال کی اساس تلاش کرنا ہے۔

علامہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کا نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ سینے میں آتش سوزاں کا ایک بے پناہ لاوا لئے ہوئے مضطربانہ ملک بہ ملک پھرتے رہے۔ قلم اور زبان کی پوری قوت سے چیختے چلاتے رہے۔ اگر ایسی عظیم و عمیق تاثیر کا مالک انسان خوش قسمتی سے سید بھی تھا، کوئی پیری بزرگی کا دعویٰ کر لیتا تو یقیناً لاکھوں کی بھیڑ اپنے گرد جمع کر لیتا۔ اور آج ایک بڑا فرقہ "جمالیہ" ان کی قبر کا طواف کر رہا ہوتا اور تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام قرار دے رہا ہوتا — لیکن انھوں نے اس کے برعکس ایک عام بیداری کی لہر پیدا کی جو اسوقت

تمام دنیائے اسلام کو مضطرب کئے ہوئے ہے، وہ ایک آگ سینوں کو دے گئے جو کبھی بجھنے والی نہیں۔

ہمارے اپنے ملک میں سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا اس کی بنیاد بھی اسلام کا وسیع و عمومی تصور تھا، ان کی راہ میں ہندو یا عیسائی رکاوٹ نہیں بنے، خود مسلمانوں کے موثر ترین طبقوں نے پوری قوت سے ان کو ناکام بنانے کی کوششیں کیں، لیکن ان کے بے پناہ اخلاص و استقلال نے سب کو نیچا دکھایا۔ اور آج ان کے لگائے ہوئے درخت سے دوست دشمن سب نفع حاصل کر رہے ہیں۔ اگر وہ قدوۃ السالکین یا مہدی دوراں بننا چاہتے تو ان کا وجیہ چہرہ اور سیادت انتسابی فوراً انھیں کامیابی سے ہم کنار کر دیتی۔ فتوٰی کفر لگانے والے اور گالیوں کے قصائد لکھنے والے نہایت آسانی سے ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہو جاتے! لیکن وہ جانتے تھے کہ اس قسم کی حرکات صحیح اسلامی روح کے منافی ہیں۔ اس لئے اس نوع کا پست و ذلیل خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں آیا۔

سرسید کے بعد جو عجیب و غریب اصلاحی قدم اٹھا، وہ ہمارا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا آوازہ بلند کیا، ان کی زندگی ہی میں ان کے خیالات کی دھوم اکناف عالم میں پھیل گئی۔ حساس نوجوان ان کے گرد جمع ہونے لگے، کئی مرتبہ انھیں ایک جماعت عاملہ بنانے کو کہا گیا، لیکن وہ جماعت سازی کے عواقب کو جانتے تھے۔ اس لئے اس پر آمادہ نہ ہو سکے۔ البتہ اپنے کلام نظم و نثر اور نجی صحبتیوں کے ذریعے خیالات میں ایک صالح انقلاب پیدا کرتے رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنے آخری زمانے میں مقتدائے جماعت بننے کی ہامی بھر لیتے تو نہایت آسانی سے ایک فرقہ اقبالیہ وجود میں آجاتا جو آج مسلمانوں سے دست و گریباں ہو رہا ہوتا! اقبال نے اپنی قوم کو جو دولت دی ہے، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ قوم کو ابھی اس کا پتہ نہیں۔ قوم ابھی ان جواہرات کو معمولی خرمہرے سمجھ کر ان سے کھیل رہی ہے۔ جب کوئی نسل اس کو سمجھنے اور برتنے والی پیدا ہوگی تو مسلمان تمام اقوام عالم سے سربلند ہونگے (انشاء اللہ)

نہاں خانۂ مشیت کے اسرار کو کون جان سکتا ہے؟ لیکن ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر مقصد، وہ شور انگیز طوفانی داعیہ جو قلب افغانی سے ابھرا اور ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا اقبال کے "سوز و ساز آرزومندی" میں نمودار ہوا۔ آج ہمارے سامنے طلوع اسلام اور معارف القرآن کے عظیم مجلدات کی شکل میں آرہا ہے ـــــ ہم کو سرسید کی بعض تحقیقات سے ہزار اختلاف ہو لیکن ہم اس کی روح اخلاص کے منکر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ہم طلوع اسلام کے مباحث سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ اس کا مطالبہ ہے کہ اس کی پیش کردہ تحقیق کو حرف آخر سمجھا جائے کیونکہ پیغمبر کے بعد ایسے مطالبے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طلوع اسلام کا قلم سارے مسلمانوں کے لئے گردش کر رہا ہے اور مسلمانوں کو ان کے اصلی مرکز پر لا کر سارے عالم انسانیت کو اسلام سے روشناس کرانا اس کا واحد نصب العین ہے، وہ نہ کسی شخصیت کو اپنی دعوت کا محور بنانا چاہتا ہے اور نہ کسی فرقے کی بنیاد رکھنا اس کا مقصد ہے، کیوں کہ یہ اس کے نزدیک شرک یا شرک سے بھی بدتر ہے۔ بلکہ وہ اقبال کے الفاظ میں اس امر جامع کا داعی ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے روم کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر

جہاں تک ہمیں معلوم ہے آج تک یہ نخل محترم پرویز صاحب کے خون سے سینچا گیا۔ ان کے جسم و دماغ کی قوتیں اور ان کے جیب و دامن

کی دولتیں اس مقدس اور ارفع و اعلیٰ نصب العین پر نچھاور ہوئیں۔ قوم میں جہاں بے شمار دشنام فروش ہیں وہاں کچھ ایسے صاحبِ نظر بھی ہیں جنھوں نے اس لعل گلیم کے جوہر اخلاص کو سمجھا اور اپنی مالی اعانت پیش کی، مگر اُدھر سے قبول نہ کی گئی۔ جب تک ان کے حالات نے دست یاری کی وہ تنہا اس میدان میں ڈٹے رہے۔ لیکن اب حالات نے دگرگوں شکل اختیار کرلی ہے۔ جس محدود سی شکل میں یہ کام اسوقت تک ہوتا رہا ہے (اور ہو رہا ہے) کام کی اہمیت اور زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر، وہ شکل بالکل ناکافی ہے — دوسری طرف محترم پرویز صاحب نے ارادہ کرلیا ہے کہ وہ اپنی بقایا زندگی کے تمام لمحات اسی مقصد کے لئے صرف کردیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے وسائل و ذرائع اور بھی محدود ہو جائیں گے۔ وہ اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں چاہتے لیکن یہ امر عظیم تو ان محدود وسائل سے حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کے پاس فکر و نظر، علم و بصیرت کی دولت ہے، لیکن قارون کا خزانہ نہیں۔ ان کے سامنے بہت بڑا کام ہے وہ ملت کے ہر ہر فرد کو سچے اسلامی معاشرے کی برکتوں سے خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت جو لوگ ان کی اس فکر کو اصولاً صحیح اسلامی فکر اور حقیقی منشاء قرآن سمجھنے میں ان کے ساتھ متفق ہیں۔ آگے بڑھیں جو کچھ ان کے پاس ہے لیکر آگے پھیلائیں۔

اسوقت سوال مسائل پر لڑنے اور الجھنے کا نہیں، سوال زندگی کا ہے، زندگی کچلی جارہی ہے، جب زندگی ہی نہ ہوگی تو مسائل کس کام آئیں گے۔ زندگی، صحیح زندگی سب سے بڑا انسانی مسئلہ ہے، سب سے اہم اسلامی سوال ہے۔ مفکرین عالم کے سامنے حقیقتاً صرف یہی ایک سوال ہے، لیکن امت مسلمہ کو ابھی تک انہی مقدس کھلونوں سے بہلایا جارہا ہے جن کی قیمت بازارِ زندگی میں ایک کوڑی بھی نہیں۔ اور جن کا ذکر کتاب زندگی (قرآن) کی ایک آیت میں بھی نہیں۔ سارا عالم اسلام اپنے گھر کی دولت سے بے خبر اغیار کی طرف بھیک کی نگاہیں پھیلائے ہوئے ہے۔ گرد و پیش میں غیر قرآنی مذہب کے تسلط کی وجہ سے کوئی نہیں جانتا کہ قرآن ثوابِ تلاوت سے آگے کچھ اور بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو کسی اور جگہ سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اقبالؒ نے اجمال سے بھی اور تفصیل سے بھی بتائی۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

اس "چیزے دیگر" کے چہرے سے نقاب صرف پرویز کے قلم سے اُٹھ رہا ہے۔ لیکن پرویز تنہا ہیں اور یہ مقام وہ ہے جہاں مبعوث من اللہ ہستیوں کو بھی مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟ کی آواز دینا پڑی۔ اور وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ کی التجا کرنا پڑی۔ یہ دو آوازیں دو بڑے پیغمبروں عیسیٰؑ و موسیٰؑ کی زبان سے نکلی تھیں کہ ہم تنہا اعلان حق کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتے۔ ہمیں مددگاروں کی ضرورت ہے۔ یہ قدیم دنیا کے دو چھوٹے چھوٹے گوشوں کی ضرورت تھی۔ آج ساری وسیع دنیا کی ضرورت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے لئے کتنے "انصار" اور کتنے "وزرا" کی ضرورت ہو سکتی ہے؟ فرقہ بندی انسانیت کی ہیئت اجتماعیہ کے لئے موت ہے، لیکن مسلمانوں کی مذہبی قیادت اس موت کا شکار ہوتے ہوئے بھی اس کو سمجھنے سے قاصر ہے — اور قرآن — تنہا قرآن اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اس آواز کو اطرافِ عالم میں پھیلانے کے لئے بہت بڑی کوشش، ایثار اور قربانی کی ضرورت ہے۔ نسل و خاندان اور وطنیت و قومیت کے لئے جو قربانیاں اور کوششیں کی جاتی رہیں۔ ان سب سے بڑھ چڑھ کر یہ جامعہ انسانیت پیکر واحد ہے۔ اس کی ایک ایک انگلی یا رگ و ریشہ کو الگ الگ کرکے ان کی

دیکھ بھال کرنیوالے اس کو ختم کر رہے ہیں۔ قرآن اس سب کی خیر و فلاح چاہتا ہے۔ غیر قرآنی لٹریچر نے یہ نکتہ ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ آج یہ تقاضا بہت ابھر کر ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ آج قرآن بولتا اور چلاتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی فرقے یا کسی مخصوص خطۂ ارض کی کتاب نہیں۔ بلکہ میں زمین و آسمان کا نور ہوں۔ جس کی تابانیوں سے تم اپنی کم نگاہی بلکہ کور چشمی کے باعث محروم ہو رہے ہو۔

یہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے راقم الحروف کا احساس نہیں، بہت سے قرآن پر غور کرنے والوں کی ترجمانی ہے۔ شاید اس سے زیادہ اہم وقت اب ان کیلئے نہیں آئے گا کہ قرآن کے نور کو آشکار کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی جان سے مال سے اس کے مددگار ہو جائیں ۔۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللہَ یَنْصُرْکُمْ ۔۔ اللہ کی مدد یہی ہے کہ مقاصد الٰہیہ کی مدد کی جائے جو در اصل ہماری اپنی مدد پہ منتج ہوگی۔

"طلوعِ اسلام" کے گزشتہ نمبروں میں ایک سو روپیہ ادا کرنے والے معاونین کی تحریک چلائی گئی ہے۔ میں اپنے خون کے ایک ایک قطرے سے اس کی تائید کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنے دوستوں کی جیبوں کو چھین چھین کر اس خزانے کو بھر دوں، صرف ایک سو نہیں۔ جو زیادہ دے سکتے ہیں، وہ کیوں زیادہ نہ دیں اور جو غریب تڑپ رکھتے ہیں اور کچھ نہیں دے سکتے یا کم از کم دے سکتے ہیں۔ ان کو محروم کیوں رکھا جائے۔

میرے بھائیو! آؤ اس قافلے میں شامل ہو جائیں اور جس سے ہو سکتا ہے کر گذرے۔ تاخیر و درنگ کا وقت گزر گیا۔

مگو فردا کہ فرداہا گزشت　　تا بجنبی بگذرد ایام کشت

اب یہ نہ دیکھئے کہ فلاں طرف سے پہل ہو تو ہم اٹھیں، بلکہ کوشش کیجئے کہ کسی کا قدم آپ سے آگے بڑھنے نہ پائے۔ آپ کا نام "سابقون" کی فہرست میں شامل ہونے سے نہ رہ جائے ۔۔۔ آخر میں چند مشورے عرض کرتا ہوں۔

۱ ۔۔ جو اصحاب دستِ تعاون دراز کریں ان کے اسماء ہر ماہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہیں۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ تمام قارئین کو کام کی رفتار معلوم ہوتی رہے گی اور جو دوست ابھی شامل نہیں ہوئے ان کیلئے تذکیر و ترغیب کا ذریعہ ہوگا۔[1]

۲ ۔۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کی سنت یہی ہے کہ پیش نظر غلط اعمال و عقائد کی تغلیط و تخریب کی جائے اور ان کے ساتھ ساتھ صالح اعمال و عقائد کی تحکیم و تشریح ہوتی رہے۔ اسی نہج پر طلوعِ اسلام کو یہ دونوں کام انجام دینا ہیں ۔۔ تخریبِ غیر قرآن اور تعمیرانی القرآن ۔۔ اس بارے میں مشورہ یہ ہے کہ تخریب میں صرف "الْأَہَمُّ فَالْأَہَمُّ" کو مدِ نظر رکھا جائے۔ غیر اہم امور میں زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے اور تعمیری مواد کی طرف بہت زیادہ دھیان دیا جائے۔[2]

۳ ۔۔ اردو کے علاوہ دوسری مروج زبانوں، انگریزی، عربی وغیرہ میں بھی قرآن کی غیر فرقہ وارانہ عالمگیر پوزیشن واضح کی جائے۔[3]

۴ ۔۔ جس طرح مرکز (کراچی) میں احباب کا ہفتہ وار اجتماع تجدیدِ فکر، تکرارِ مباحث اور تازگیٔ خیالات کا موجب ہو کر تدریجی ترقی کر رہا ہے[5]۔ اسی طرح باہر کے تمام دوستوں سے بھی ہفتہ وار ربط پیدا کیا جائے۔ جو ایک ہفت روزہ انگریزی و اردو اخبار کے ذریعے ممکن ہے۔[4]

آؤ ان مشوروں کو عملی شکل دینے کے لئے اپنا علم، مال اور وقت اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ عرشی ۔ کراچی۔ کھوری گارڈن۔ معرفت ایم اے شبلہ۔

---

[1] اس کی تعمیل اسی پرچے سے شروع کر دی گئی ہے۔

[2] دلی شکریہ۔ اربابِ فکر و نظر کے مخلصانہ مشورے طلوعِ اسلام کیلئے ہمیشہ باعثِ شکریہ ہوتے ہیں۔ اصلاحِ کار کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

[3] و [4]۔ طلوعِ اسلام کے سامنے یہ مقصد پہلے ہی سے موجود ہے لیکن اسکے موجودہ وسائل کے ذریعے جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اسی کا نباہنا مشکل ہے۔ اس سے آگے قدم کس طرح اٹھایا جائے؟

[5] ہر اتوار صبح ۹ بجے محترم پرویز صاحب اپنے مکان واقعہ ۲۲ فاؤلر لائن۔ نیپئر بارکس پر قرآنی مباحث پر گفتگو فرماتے ہیں۔ اسی اجتماع کی طرف اشارہ ہے۔

حلقۂ معاونین طلوعِ اسلام

قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جو مشکلات ہمارے سدراہ ہو رہی ہیں، ان کا ذکر طلوع اسلام کی مئی ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ قارئین طلوع اسلام میں سے معاونین کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ یہ حضرات ایک سو روپیہ یکمشت یا چار ماہانہ اقساط میں ادا کریں تو انھیں دو سال کیلئے طلوع اسلام بلا قیمت دیا جائے گا اور دو سال کے عرصہ میں طلوع اسلام کی طرف سے جس قدر مطبوعات شائع ہوں گی وہ بھی بلا قیمت نذر خدمت کی جائیں گی۔ اگر دو سال کے عرصہ میں ایک سو روپیہ کی مالیت کی کتابیں شائع نہ ہو سکیں تو یہ مدت بڑھا دی جائے گی تا آنکہ ایک سو روپیہ کی کتابیں معاونین کی خدمت میں پہنچ جائیں۔ اس تجویز پر حسب ذیل حضرات نے لبیک کہا ہے۔ (یہ فہرست وسط جون تک کی ہے)۔

کراچی

(۱) ڈاکٹر سعید احمد صاحب

(۲) محترم محمد ایوب صاحب

(۳) محترم محمد حسن صاحب۔ لارنس روڈ

(۴) محترم محمد سعید صاحب (نزد کوپرہ مل)

(۵) محترم محمد نذیر صاحب (نزد جوبلی سینما)

(۶) ڈاکٹر محمد صادق صاحب

(۷) محترم عرشی صاحب

(۸) محترم عبدالرحمٰن صاحب (پٹیل روڈ)

(۹) محترم حاجی محمد دین صاحب

لاہور

(۱۰) خانبہادر عبدالرحمٰن صاحب چغتائی

(۱۱) سید غلام مصطفےٰ صاحب (ماڈل ٹاؤن)

(۱۲) عبدالصمد خاں صاحب (ماڈل ٹاؤن)

(۱۳) محترم عبدالرحیم صاحب چغتائی

حیدرآباد سندھ

(۱۴) محترم اے ایس اخوند صاحب

منٹگمری

(۱۵) محترم عبدالحی صاحب

(۱۶) محترم محمد ایوب خاں صاحب

(۱۷) ڈاکٹر عبدالقادر صاحب

پشاور

(۱۸) ڈاکٹر عبدالغفور قریشی صاحب

(۱۹) محترم سلطان محمد نعیم صاحب

قصور

(۲۰) محترم قدیر صاحب (این ڈبلیو آر)

(۲۱) محترم رضوان الحق صاحب

گوجر خاں

(۲۲) محترم مشتاق احمد صاحب

جہلم

(۲۳) محترم طالب حسین صاحب

گجرات

(۲۴) محترم علاؤالدین صاحب ارشد

راولپنڈی

(۲۵) شیخ محمد فیروز صاحب (محلہ قطب الدین)

لائلپور

(۲۶) محترم مختار الجلیل صاحب (پرانی غلہ منڈی)

درکھانہ

(۲۷) محترم شاد اقبال صاحب۔ درکھانہ ضلع ملتان

ہم ان حضرات کے بہ دل شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی ہیں جنھوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ اس رقم کے معاوضہ میں کچھ بھی نہیں لینا چاہتے۔ ہمارے دل میں ان کے اس جذبۂ اخلاص کی بھی بڑی قدر ہے۔

(۲) آپ اس کام کی اہمیت اور ان مقاصد کی ہمہ گیری کو سامنے رکھئے جن کیلئے ہم نے یہ اپیل شائع کی تھی اور اس کے بعد اس رقم کو نگاہ میں لائیے جو ان مقاصد کیلئے ہمیں موصول ہوئی ہے۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ یہ مقاصد کس طرح بروئے کار آسکیں گے مختصر الفاظ میں پھر سن لیجئے کہ یہ مقاصد کیا ہیں۔

(الف) قرآنی لٹریچر کی عام اشاعت۔ اسوقت تک ہم صرف یہ چار کتابیں شائع کر سکے ہیں۔ (۱) اسلامی نظام (۲) قرآنی دستور پاکستان۔ (۳) اسباب زوال امت۔ (۴) قتل مرتد ـــــ اسوقت ہمارے پاس حسب ذیل کتابیں پریس میں بھیجنے کیلئے تیار رکھی ہیں۔

(۱) قرآنی فیصلے۔ (۲) سلیم کے نام خطوط کا مجموعہ۔ (۳) مقام حدیث (دو جلدوں میں)۔ (۴) جشن نامے (۵) اعمالنامے (۶) فردوس گم گشتہ

(ب) محترم پرویز صاحب نے بتوفیق ایزدی اپنی دو معرکہ آرا جدید تصانیف کی تکمیل کر لی ہے۔ یعنی نظام ربوبیت اور معارف القرآن کی پانچویں جلد۔

ان گرانقدر تصانیف کے مسودات دیکھنے کے بعد اب ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج تک اس انداز کی کتابیں کسی زبان میں بھی شائع نہیں ہوئی ہوں گی۔ کارل مارکس نے کمیونزم کا مینی فسٹو (منشور) لکھا جو جدید اقتصادی انقلاب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اس مفکر قرآن نے نظام ربوبیت لکھ کر دنیا کو ایک ایسی انقلابی تحریک سے روشناس کرایا ہے جو فساد آدمیت کے ہر شعبہ کو ختم کر کے اس زمین پر خدا کا تخت اجلال بچھانے کیلئے وجود میں آئی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب انسانیت کی نشأۃ ثانیہ کیلئے دلیل راہ بن جائے گی۔ اور اگر اس کے تراجم دوسری زبانوں میں بھی شائع کر دیئے جائیں تو اس کا بھی امکان ہے کہ دنیا اس تباہ کن تصادم سے بچ جائے جس کا خطرہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔

باقی رہی معارف القرآن کی پانچویں جلد تو اس کا خاکہ ہی عجیب و غریب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول کا عنوان ہے "انسان نے کیا سوچا؟" اس میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو اڑھائی ہزار سال کے عرصہ میں انسانی فکر نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کیلئے سوچا ہے۔ اس مسودہ کو دیکھ کر انسان فی الواقعہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ یا اللہ! ایک تنہا شخص اپنی اسقدر مصروفیتوں اور موانع کے باوجود کس طرح اتنی کتابوں پر عبور حاصل کر سکتا ہے اور پھر کس طرح ان سب کا نچوڑ ایک مربوط تصنیف کی شکل میں پیش کر سکتا ہے۔ اس کتاب سے اس قرآنی مفکر کی وسعت نگاہ اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ تمام کوشش اس نے کی ہے یہ بتانے کیلئے کہ جس جس مقام پر انسانی فکر تھک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

وہاں کس طرح قرآن کی روشنی اس کیلئے خضر راہ بن جاتی ہے۔ یہ اس کا دوسرا حصہ ہے۔

(ج) ان تمام تصانیف کے علاوہ ان تصانیف سے بڑھ کر محترم پرویز صاحب کی وہ کوشش ہے جسے انھوں نے اپنی زندگی کا منتہا قرار دے رکھا ہے یعنی قرآن کے مفردات کی جامع لغت اور اس کی روشنی میں دور حاضرہ کی علمی سطح کے مطابق قرآن کا مفہوم۔ ان کی اس کوشش کے متعلق تو کچھ لکھنا ہی بیکار ہے جو حضرات ان کی بصیرت قرآنی سے واقف ہیں وہ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ چیزیں کیا ہونگی۔

یہ تو رہا حصۂ تصنیف و تالیف اردو زبان میں۔ ضرورت یہ ہے کہ ان کتابوں کو کم از کم انگریزی اور عربی زبان میں بھی شائع کیا جائے۔ اس کیلئے ایک مستقل شعبہ کی ضرورت ہے۔

(د) اب آیئے طلوع اسلام کی طرف۔ اتنی عظیم انقلابی فکر کیلئے ایک ماہوار مجلہ کسی صورت میں بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر اگر روزنامہ نہیں تو کم از کم اردو اور انگریزی میں دو ہفتہ وار پرچے تو ناگزیر ہیں۔

یہ ہے مختصراً ہمارے پیش نظر کام کی تفصیل جس کیلئے ہمیں اس وقت تک صرف تقریباً دو ہزار روپیہ موصول ہوا ہے (کیونکہ ستائیس حضرات میں سے بعض نے پچیس پچیس روپے کی قسطیں ہی ادا کی ہیں) آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ ان مقاصد کیلئے کسقدر روپیہ کی ضرورت ہے اور اس دو ہزار سے کیا کچھ بن سکے گا۔

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

طلوع اسلام اس چھ برس کے عرصہ میں ہزارہا روپیہ کا نقصان اٹھا چکا ہے لیکن اس گرانباری کا سلسلہ لامتناہی طور پر جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جو مقاصد اس کے پیش نظر ہیں وہ واقعی زندگی بخش ہیں اور جو کام یہ کرنا چاہتا ہے وہ کرنے کا ہے تو پھر اس کام کے کرنے کی سبیل پیدا کیجئے اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ بیکار ہے تو ہمیں اپنی رائے سے مطلع فرمایئے تاکہ ہم بھی اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے مستقبل کے متعلق کچھ آخری فیصلہ کر سکیں۔

طلوع اسلام نے یہ سو سو روپیہ کی رقم بطور عطیہ نہیں مانگی صرف بطور پیشگی مانگی ہے اگر اس کے اسقدر وسیع حلقے میں سے اس حد تک جانے کیلئے بھی صرف ستائیس افراد ہی نکلتے ہیں تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے ــــ آپ اس پر ذرا گہری توجہ دیجئے اسلئے کہ طلوع اسلام کی قرآنی تحریک کے مستقبل کا فیصلہ شاید آپ کے دور کا بہت بڑا فیصلہ ہوگا۔ ہمیں سو سو روپیہ بطور پیشگی دینے والے کم از کم ایک ہزار افراد کی ضرورت ہے جس کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ قارئین طلوع اسلام میں سے کم از کم سو آدمی ایسے نکل آئیں جو ادارہ کو کم از کم دس معاونین مہیا کر دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیں اور تندہی کے ساتھ کام کریں۔

واضح رہے کہ اگر طلوع اسلام کو یہ معاونت بہم نہ پہنچی اور (دل دھڑک رہا ہے کس طرح یہ لکھیں۔ لیکن لکھے بغیر چارہ بھی نہیں کہ) اس سلسلہ کو ختم کر دینا پڑا تو طلوع اسلام اس "قرضہ" کی ایک ایک پائی واپس دیکر اپنے آپ کو ختم کرے گا۔ جب ۱۹۴۲ء میں اس کی اشاعت ملتوی ہوئی تھی تو اس نے خریداروں کے چندہ کا بقایا بھی واپس کر دیا تھا۔

والسلام

ناظم ادارۂ طلوع اسلام کراچی

حقائق وعبر

ملّا کا اسلام

ماہوار مجلہ چراغ راہ کی اشاعت بابت مئی ۱۹۵۳ء کے پہلے صفحہ پر امین احسن اصلاحی صاحب کا ایک شذرہ شائع ہوا ہے اصلاحی صاحب کے متعلق آپ شاید اتنا ہی جانتے ہوں کہ وہ جماعت اسلامی کے اساطین میں سے ہیں۔ لیکن ان کا تفصیلی تعارف ماہر القادری صاحب نے ان الفاظ میں کرایا ہے۔

عالم۔ بلند نظر اور متبحر عالم، جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے اور مہ وانجم کی گذرگاہوں کا بھی سفر کرتی ہے۔ دس بیس نہیں ہزاروں راتیں صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جس کی ذات قرآنی علوم کیلئے قابل وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔ (فاران جون ۱۹۵۳ء)

انہی امین احسن اصلاحی صاحب نے چراغ راہ میں تحریر فرمایا ہے:۔

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کردیں۔ نہ **بندوں** کو اس بات کی طاقت حاصل ہے، نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔

آپ نے غور کیا کہ اصلاحی صاحب نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ — **بندوں** کو اسکی طاقت حاصل نہیں کہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت کی طرح حکومت قائم کردیں۔ گویا حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم بندے نہیں تھے۔ بندوں سے اوپر کچھ اور تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بندہ ہی قرار دیتا ہے۔ اور ہر انسان اس شہادت کے بعد مسلمان ہوسکتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں (اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ) یعنی اصلاحی صاحب کے ارشاد کے مطابق حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رسول اللہ سے بھی (معاذ اللہ) اونچے تھے۔

اور پھر یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے کہ خدا نے بھی مومنین کو یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسی حکومت قائم کریں۔

اسی قسم کے وہ احبار ورہبان ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تمہیں خدا کے بندہ سے آگے کچھ اور سمجھیں تو وہ جواب میں کہیں گے کہ حاشا وکلا میں اس کی جرأت کس طرح سے کرسکتا تھا؟

یہ تو ہیں اصلاحی صاحب جن کے نزدیک صحابہ کبار بندے نہیں، بندوں سے آگے کچھ اور ہیں۔ لیکن دوسری طرف اسی جماعت اسلامی کے امیر (مودودی صاحب) ان صحابہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام یا بزرگان سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے

عمل کو اپنے لئے قانون زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمان خدا و رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔ (طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۰ء ص۷۵)

یہ کچھ مودودی صاحب نے حضرت علیؓ کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ اسی قسم کے خیالات انھوں نے حضرت عائشہؓ کے متعلق بھی تحریر کئے تھے ملاحظہ ہو ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء ص۱۲۔ یعنی اس جماعت کے ایک رکن اعلیٰ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ صحابہ کبار بندے نہیں تھے بندوں سے آگے کچھ اور تھے۔ اور خدا نے بندوں کو قطعاً اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا کہ وہ ان جیسے بنیں اور ان جیسی حکومت قائم کریں۔ اور اسی جماعت کے امیر کا ارشاد یہ ہے کہ اولالعزم صحابہ خدا و رسول کے فیصلوں کے خلاف بھی کام کرتے تھے۔ اور ان سے لغزشیں بھی سرزد ہوتی تھیں جن کی ہمیں تقلید نہیں کرنی چاہئے۔

اور جماعت اسلامی کے عقیدتمندوں کا حلقہ اصلاحی صاحب کو بھی قرآن کا بے بدل عالم قرار دیتا ہے اور امیر جماعت اسلامی کیلئے بھی یہ لکھتا ہے کہ کوئی شک نہیں کہ مودودی کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ (فاران بابت جون ۱۹۵۳ء)

۲۔ کس کی مانیں؟

۱۸ اپریل ۱۹۵۳ء کو محترم غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو برطرف کرتے ہوئے سرکاری کمیونک میں ارشاد فرمایا تھا کہ خواجہ صاحب کی وزارت اسقدر نااہل ثابت ہوئی ہے اور انھوں نے ملک کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ گورنر جنرل مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیتے ہوئے خواجہ صاحب کو برطرف کر دیں اور ان کی جگہ محترم محمد علی صاحب کو وزیر اعظم مقرر کریں۔

نئے وزیر اعظم مسٹر محمد علی صاحب نے ۲۳ اپریل ۱۹۵۳ء کو ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس کی روئیداد ۲۴ اپریل کے روزنامہ ڈان میں ان الفاظ میں شائع ہوئی تھی۔

مسٹر محمد علی نے خواجہ ناظم الدین صاحب کی قومی خدمات کی تعریف کی اور فرمایا کہ خواجہ صاحب کیلئے جو پنشن منظور کی گئی ہے وہ قوم کی طرف سے ان کی حسن خدمات کی سپاس گذاری ہے۔

قوم حیران ہے کہ وہ کس کی مانے اور کس کی نہ مانے؟

۱۔ اقبال اور شیکسپیر

۲۷ اپریل کے ایوننگ ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ۲۷ اپریل کو STRAT FORD کے مقام پر شیکسپیر کا جنم دن منایا گیا جس میں چھپن ۵۶ ممالک کے نمائندے شامل ہوئے۔ ان میں چار ہائی کمشنر تھے، سولہ سفراء اور بارہ وزراء۔ پاکستان کے ہائی کمشنر مسٹر اصفہانی بھی شریک اجلاس تھے۔ اس تقریب پر سیاسی اقوام کے جھنڈے لہرائے گئے۔ ان میں ایک جھنڈا خود ملکۂ الزبتھ کا پیش کردہ بھی تھا۔

اس تقریب کے ایک ہفتہ پہلے پاکستان کے دارالسلطنت کراچی میں بیچارے اقبال کی بھی برسی منائی گئی۔ اس میں سفراء میں سے تو ڈاکٹر عزام بے شریک ہوئے جنھیں اقبال سے ذاتی طور پر والہانہ عشق ہے اور وزرائے حکومت میں سے مسٹر گورمانی جنھوں نے جلسہ میں تقریر کرنی تھی۔ ان کے علاوہ نہ کوئی سفیر آیا نہ وزیر۔ نہ کوئی جھنڈا لہرایا گیا نہ سلامی دی گئی۔

شیکسپیر نے اپنی قوم کو کچھ ڈرامے دیئے اور اقبال نے پاکستان۔ باقی فرق اتنا ہی ہے کہ شیکسپیر انگریزوں میں پیدا ہوگیا اور اقبال ہم میں!۔

۴۔ "ملاقات عام"

جب پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت نئی نئی قائم ہوئی تھی تو انھوں نے عوام کو یقین دلانے کیلئے کہ وہ ان کے خادم ہیں اور ہر شکایت کا بذات خود ازالہ کردیں گے۔ یہ اعلان کیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن "ملاقات عام" کیلئے مخصوص رکھیں گے جس میں ہر شخص ان کے پاس آکر اپنی شکایات بیان کرسکے گا۔ بات بظاہر سہل نظر آتی تھی اور اس کا خوب چرچا ہوا کیونکہ ایسا عوامی وزیر اعلیٰ صوبے کو پہلی بار میسر آرہا تھا۔ اس گرما گرمی میں دو ایک عام ملاقاتیں ہوئیں لیکن اس میں جو غرض مندوں کا تانتا بندھا اور شکایات کے طومار جمع ہوئے تو وزیر اعلیٰ صاحب کے اوسان خطا ہوگئے۔ چنانچہ کوئی گنتی کی دو ایک ملاقاتوں کے بعد یہ اعلان شروع ہونے لگے کہ وزیر اعلیٰ صاحب بوجہ مصروفیت فلاں دن ملاقات عام منعقد نہیں کرسکیں گے۔ اس طرح چند ایک ملاقاتیں ملتوی ہوئیں تو لوگوں کو عادت سی پڑگئی اور وہ آہستہ آہستہ بھول ہی گئے کہ دولتانہ صاحب نے انھیں محفل میں باریابی کا اذن عام دے رکھا تھا۔

اب دولتانہ صاحب کے بعد ملک فیروز خاں نون صاحب تشریف لائے ہیں۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کے مصداق انھوں نے "ملاقات عام" کو ایک ادنیٰ پیمانے پر رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ دفاتر میں جو شکایات موصول ہوتی ہیں یا عملہ کی اپیلیں وغیرہ آتی ہیں، ان کی نقول حکام بالا، حتیٰ کہ متعلقہ وزیر تک کو بھی بھیجی جاسکتی ہیں۔ اس رعایت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس طرح ان کاغذات پر کارروائی جلدی مکمل ہوجایا کریگی۔ جن لوگوں کو دفاتر میں کام کرنے یا دفاتر سے کام لینے کا تجربہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ صدور احکام میں تاخیر کا باعث یہ نہیں کہ موجودہ قواعد کی رو سے شکایات و مراسلات کی نقول ایک معین افسر سے اوپر نہیں بھیجی جاسکتیں۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس ممانعت کے باوجود نقلیں بھیجنے والے بالاحکام حتیٰ کہ وزراء تک کاغذات براہِ راست بھجوادیتے ہیں۔ لیکن ان کا بالعموم حشر یہ ہوتا ہے کہ وہ درجہ بدرجہ ماتحت حکام کے نام منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ اس بند پانی کے جوہڑ میں آجاتے ہیں جہاں اس سے پیشتر کئی اور کاغذات گل سڑ رہے ہوتے ہیں۔ اب اس نئی تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسی نقول ہر افسر کے نام تفریق و ممانعت جاسکیں گی۔ لیکن یاد رہے کہ یہ احکام اس بات پر مکلف نہیں کہ وہ ان کاغذات پر ضرور کارروائی کریں۔ تو گویا ہوگا وہی کچھ جواب ہو رہا ہے کہ کاغذات کی نقول ہر کہ ومہ کے پاس پہنچ جایا کریں گی اور اور پھر وہ تمام علیحدہ علیحدہ نالیوں سے بہ کر ایک ہی دفتر اور ایک ہی کلرک کے پاس جمع ہوجایا کریں گی۔ اس طرح کئی دفتری نالیاں

بہا شروع ہو جائیں گی اور ان میں ہر وقت کاغذی ناؤیں چلتی رہیں گی جس سے کئی آدمی مصروف کار نظر آئیں گے۔ لیکن کام کی رفتار یا تو وہی رہے گی یا اس سے بھی سست تر ہو جائے گی اور غریب شکایت کرنے والوں کا کچھ بھی بھلا نہیں ہوگا۔ البتہ اس سے عملہ میں اضافہ ہوگا کیونکہ "کام" بڑھ جائے گا۔

کیا ہمارے لیڈر کوئی تعمیری تجاویز نہیں سوچ سکتے جو مثبت نتائج پیدا کریں اور عوام کے دکھوں کا مداوا ثابت ہوں؟

۵۔ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی!

اقبال نے مختلف پیرایوں میں غلامی کے ان اثرات کو بیان کیا ہے جو انسانی معاشرہ میں مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے:

موت ہے اک سخت تر جس کا غلامی ہے نام

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی

غلامی واقعی زندگی کو تمام تر حسن و زیبائی سے محروم کر کے غلام انسانوں کو موت سے بھی سخت تر منزل میں پہنچا دیتی ہے۔ ہم کہنے کو آج سے کوئی چھ سال پیشتر "آزاد" ہو گئے تھے اور اب تک "آزاد" ہیں۔ لیکن اس "آزادی" اور غلامی میں کیا فرق ہے؟ اس کا اندازہ اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو حال ہی میں ڈاکٹر ہاوسٹن نے دیا۔ ڈاکٹر موصوف اس قافلہ کوہ پیمایانِ مغرب کے سالار ہیں جو ان دنوں پاکستان میں ننگا پربت کی چوٹی سر کرنے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے متعلقہ علاقہ پہ پرواز کی اور طائرانہ نگاہ سے جو کچھ دیکھا، اس کے متعلق فرماتے ہیں:

> جب تک میں نے ان علاقوں پر پرواز کی نہیں تھی، میرے تصور میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا کہ پاکستان میں ایسے عظیم الشان قدرتی مناظر پائے جاتے ہیں جو دنیا میں بے نظیر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دریائے سندھ کے پرپیچ سواحل کے ساتھ ساتھ لاتعداد برف پوش چوٹیاں جن میں سے بعض فضا کو چیرتی ہوئی پانچ پانچ میل تک اوپر نکل گئی ہیں سفید تیرتے بادلوں سے مل کر ایسا نظارہ پیش کرتی ہیں جو ارزمندی میں کروڑوں ڈالروں سے بیش بہا ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۔۰۔۲ (یعنی ننگا پربت) کئی اعتبار سے دنیا کا خوبصورت ترین پہاڑ ہے۔

صورت کی ان رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو کر ڈاکٹر ہاوسٹن اس رنجدہ حقیقت کا تذکرہ کئے بغیر نہ رہ سکے کہ

> میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اہل پاکستان ان سے اسقدر غیر متاثر کیوں ہیں؟

اس سوال کا جواب یا تو اقبال سے پوچھئے۔ وہ کہتا ہے: کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

یا غالب کے مندرجہ ذیل شعر میں ڈھونڈئیے:

خروشِ حلقۂ رنداں ز نازنیں پسرے است کہ سر بہ زانوئے زاہد بہ بوریا خفت است

یہ اس قوم کا حال ہے جس کی کتابِ محکم "نیکی" کیلئے "حُسن" کا لفظ استعمال کرتی ہے۔ انسانی زندگی کے ایک ایک گوشے میں حسن و خوبصورتی۔ یہ ہے قرآن کا نصب العین۔ وہ کہتا ہے: ان الحسنات یذھبن السیئات لیکن ہم نے عمل سے ثابت کر دیا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ "سیئات" کے سیلاب بے پناہ میں "حسنات" خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں ۔۔۔ لہٰذا، جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا۔

اسلامی نظام

دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ کتاب

جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں، اور وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ اہم مقالات شامل ہیں جنھوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۱۸۴ صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید گلیزڈ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش صرف دو روپے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

قرآنی دستورِ پاکستان

آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی پیشکش

پاکستان کی آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے قرآن کی روشنی میں مرتب کردہ مسودۂ قرارداد مقاصد اور مسودۂ بنیادی اصولوں کی رپورٹ جو حکومت پاکستان کے اعلان کے جواب میں ادارہ کی طرف سے حکومت کو بھیجے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید مولوی صاحبان کی طرف سے پیش کردہ بائیس نکات کا تجزیہ۔ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات اور ان کے فکر و نظر کے تضادات پر تبصرہ۔ غرض اس کتاب میں آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں وہ سب کچھ آگیا ہے جسے معلوم کرنے کی آپ کو ضرورت ہے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ کتابت طباعت دیدہ زیب کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

نوٹ: آئندہ صفحہ سے اعجاز القرآن کا مضمون شروع ہو رہا ہے۔